ادبی بھول بھلیّاں

زبان و قواعد اور اردو املا پر تنقید

برائے ہارڈنگ لائبریری کمپنی باغ دہلی معرفت سید محمد الیاس صاحب بہار آلہ آبادی

منجانب حفیظ الرحمان واصف

۲۵ر ستمبر ۱۹۸۰ء

ادبی بھول بھلیاں

زبان و قواعد اور اُردو املا پر تنقید

از حفیظ الرحمان واصف

PDF By :

Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell Number : +92 307 2128068

Facebook Group Link :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/

نام کتاب	ادبی بھول بھلیاں
موضوع کتاب	تنقید و تحقیق
نام مصنف	مولانا حفیظ الرحمان واصف
ایڈیشن	طبع اوّل
تعداد طباعت	پانسو
نام مطبع	کلر پرنٹنگ پریس بازار چتلی قبر دہلی
ناشر	محمد قاسم ابن مصنف
سال طبع	سنہ ۱۹۷۹ء م سنہ ۱۳۹۹ھ
تعداد صفحات	۱۹۲
قیمت کتاب	پندرہ روپئے

ملنے کا پتہ

کتب خانہ انجمن ترقی اُردو ۔ جامع مسجد دہلی
(دیگر کتب خانوں سے بھی طلب کیجا سکتی ہے)

فہرست مضامین

دعویٰ نہیں واصفؔ کسی فن میں مجھکو
حاصل نہیں شہرت بھی وطن میں مجھکو
قدر اس لئے کرتے ہیں سخنور میری
سائلؔ سے تلمذ ہے سخن میں مجھکو

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب میرے والد ماجد مدظلہ کے تین مقالوں کا مجموعہ ہے۔ پہلے مقالے میں کتاب "زبان و قواعد" پر تنقید کی گئی ہے۔ زبان و قواعد (مطبوعہ ۱۹۷۶ء) کے مصنف نے کتاب قاموس الاغلاط کو موضوعِ سخن بنایا ہے جو ۱۹۳۶ء میں حیدر آباد سے شائع ہوئی تھی۔ جس کو دو فاضل حضرات مولانا سید مختار احمد صاحب اور مولانا امین صاحب نے مرتب کیا تھا۔ یہ مقالہ گویا تنقید پر تنقید ہے۔ دوسرے مقالے میں کتاب "اردو املا" (مطبوعہ ۱۹۷۴ء) پر تنقید ہے۔

یہ دونوں مقالے ماہنامہ "برہان" دہلی میں اگست ۱۹۷۸ء سے جنوری ۱۹۷۹ء تک چھ قسطوں میں شائع ہوئے اور پسند کیے گئے۔ والد محترم کے بعض احباب نے اصرار فرمایا کہ ان کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ اگرچہ وہ اپنے مشاغل کی وجہ سے بہت عدیم الفرصت رہتے ہیں مگر تقاضا بہت زیادہ ہوا تو کچھ وقت نکال کر نظرِ ثانی فرمائی۔ اور ان میں کافی ردوبدل اور اضافات بھی ہوئے۔

تیسرا مقالہ ترادف الفاظ کے متعلق ہے جو تقریباً پینتیس برس پہلے لکھا گیا تھا۔ رسالہ آجکل اور رسالہ نگار میں شائع ہوا تھا۔ چونکہ وہ بھی لسانیات سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس کو بھی کتاب ہذا میں شامل کر دیا جائے۔

نام اس کتاب کا "ادبی بھول بھلیاں" رکھا گیا۔

واللّٰہ الموفق والیہ المرجع والمآب

احقر محمد قاسم عفی عنہ

ابن مولانا حفیظ الرحمان صاحب واصف

اردو بازار۔ دہلی

زبان اور قواعد
ایک تنقیدی جائزہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پانچ چھ برس قبل راقم الحروف نے ایک کتاب "اُردو مصدر نامہ" کے نام سے مرتب کرکے شائع کی تھی۔ اس کے مقدمے میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اردو ایک زندہ اور توانا زبان ہے۔ دوسری زبانوں کے جو الفاظ اُردو نے اپنا لیے ہیں اور ان میں تصرف کرلیا ہے خواہ وہ لغت کے لحاظ سے غلط ہوں، اگر فصحا و ادبا سے سندِ فصاحت حاصل کرچکے ہیں تو ان کو اصل کی طرف واپس لے جانا ممکن نہیں اور اس کی کوشش کرنا ایک فعلِ عبث ہے۔ وہ حضرات جو صحت الفاظ پر اصرار کرتے ہیں مجھے ان کی رائے سے اختلاف تھا اور ہے۔

ناگاہ ایک کتاب جو ترقی اردو بورڈ کی طرف سے شائع ہوئی ہے میری نظر سے گذری۔ کتاب کا نام "زبان اور قواعد" ہے۔ مصنف رشید حسن خاں۔ اس کتاب کو دیکھ کر مصنف کی وسعت نظر، وسعتِ مطالعہ اور صلاحیت استقرار کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کتاب بہت محنت اور تلاش و جستجو کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے مصنف کی رائے سے اختلاف بھی ہے۔ میں اس حد تک آگے چلنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ اردوئے معلی جیسی شیریں فصیح و بلیغ اور کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی زبان کو کوڑے کرکٹ کا مجموعہ بنا دیا جائے اور جھلی والوں، خونچہ والوں اور راہگیروں کو فصاحت کی سند تقسیم کردی جائے۔ اور ہر کس و ناکس کی زبان سے جو تلفظ ہم سن لیں اس کو فوراً لغت میں ٹانک لیں یا خود ہی کوئی غلط تلفظ فرض کرلیا جائے اور دوسروں سے فرمائش کی جائے کہ مان لیں اور قبول کرلیں۔

اب تو عربی فارسی الفاظ سے وہ اجنبیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اسلامی ممالک سے ہماری سرکار کے تعلقات خوشگوار ہو رہے ہیں اور خود حکومت بھی زرِ خطیر خرچ کر کے عربی فارسی سکھانے کا انتظام کر رہی ہے۔ صناع اور انجینیر اور ٹکنکل ماہرین عربی فارسی بڑے شوق سے سیکھ رہے ہیں اور جوق در جوق روانہ ہو رہے ہیں لیکن ہمیں آج بھی عربی لفظ کو عربی اور فارسی کو فارسی کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ فاضل مصنف بہت زیادہ احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ لکھتے ہیں :۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ متعدد صاحب نظر حضرات ہر زمانے میں استعمالِ عام کو سند مانتے رہے ہیں اور اردو الفاظ کے لئے صراح و قاموس سے سند لینے کو غلط طرزِ عمل سے تعبیر کرتے رہے ہیں مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے :

"لفظ خواہ کسی قوم و ملک کے ہوں مگر جب وہ دوسری قوم اور ملک کی زبان میں چلے جاتے ہیں تو ان کی مثال اُن لوگوں کی سی ہے جو پیدا کہیں ہوئے ہوں۔ لیکن جب کسی دوسرے ملک کی رعایا بن جاتے ہیں تو اس دوسرے ملک کے قاعدے اور قانون ان پر چلا کرتے ہیں۔ اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان کی پیدائش کہاں کی ہے اور یہ پہلے کس کی رعایا تھے۔ (نقوش سلیمانی)

لفظ متشکر کے ذیل میں لکھا ہے :۔

عربی میں مشکور اس کو کہتے ہیں جس کا شکریہ ادا کیا جائے۔ مگر ہماری زبان میں اس کو کہتے ہیں جو کسی کا شکریہ ادا کرے۔ اس لئے مشکور کی جگہ بعض عربی کی قابلیت جتانے والے اس کو غلط سمجھ کر صحیح لفظ شاکر یا متشکر بولنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی یہ اصلاح شکریہ کے ساتھ واپس کرنا چاہیئے۔ (ایضاً)

پھر کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ایک صاحب نے لفظ عادی کو غلط بتایا تھا۔ اس پر مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا تھا :۔

یہ ظلم آخر اُردو پر کب تک جاری رہے گا کہ جس لفظ کو وہ چاہے جتنا
اپنا لے لیکن اسے بولتے ہوئے وہ پابند دوسری زبانوں کی رہیگی۔ اور
اس کی تذکیر و تانیث میں، اس کے اعراب میں اس کی جمع بنانے میں
اسے حالت ترکیب میں لانے میں اُردو والے بے بسی سے منہ دوسروں ہی
کا دیکھتے رہیں گے۔ ذرا کسی دوسری زبان والے کے سامنے یہ اصول بیان
کرکے تو دیکھیے کہ لفظ آپکا لیکن اس کا املاء اس کا تلفظ، اس کی گرامر
سب دوسروں کا۔ (ماہنامہ تحریک دہلی)

مذکورہ بالا اقتباسات سے فاضل مصنف نے یہ غلط نتیجہ نکالا کہ الفاظ کا جو بھی تلفظ عوام میں اور جہلاء میں رائج ہے وہ قابل قبول ہے اور ہماری زبان کا گراں قدر سرمایہ ہے۔ خواہ وہ کیسا ہی غلط، بھونڈا اور مبتذل ہو۔ یعنی صحت و فصاحت کا کوئی معیار باقی نہیں رہا۔

صراح و قاموس سے فتویٰ لینا اگر جرم ہے تو ان کو اٹھا کر طاق نسیاں پر رکھدیجیے لیکن کیا سنسکرت اور ہندی کی ڈکشنریوں سے بھی چڑ ہے؟ اگر مندرجۂ ذیل الفاظ کی تحقیق مقصود ہو تو کہاں دیکھیں گے؟ ان الفاظ کی اصل کیا ہے؟ کس طبقے میں کیا تلفظ رائج ہے۔ صحیح کونسا ہے اور غلط کونسا؟

چیک، چیس، الگنی، قصابہ، چسک، کسک، قینچہ، قبوتر، پھتر، تلپنا، اونچائی کے، سلوٹ، ستانا، جکڑی۔ وغیرہ

مولانا دریابادی کی خفگی سر آنکھوں پر، لیکن باادب گذارش ہے کہ مندرجۂ ذیل جملوں میں :-

وہ مجھ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔ کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباس مجاز میں۔ مخاطب کی طوے مکسور ہے یا مفتوح؟ منتظر کی ظوے مکسور ہے یا مفتوح؟ اور کیوں؟ صراح و علم الصیغہ کی مدد نہ لی جائے تو جواب کہاں سے حاصل کیا جائیگا؟

صحیح اور غلط کا امتیاز تو اُن الفاظ میں بھی کرنا ہوگا جو خاص اردو کے ہیں یا سنسکرت اور برج بھاشا سے اردو میں آئے ہیں۔ یہاں بھی مونھ دوسروں کا ہی دیکھنا ہوگا۔ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اردو گرامر کی اساس ہی عربی گرامر ہے۔ تذکیر و تانیث، اعراب،

جمع، حالت ترکیب، املا، تلفظ، گرامر وغیرہ یہ اصطلاحات مولانا دریابادی کہاں سے لائے؟

آگے چل کر صفحہ ۱۹ پر لکھتے ہیں :-

سب سے اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ اب ایک مکمل لغت کو
کس انداز سے مرتب ہونا چاہیے اور اس میں کن کن باتوں کو نہیں ہونا
چاہیے۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ فصاحت اور معیار کے غیر منطقی تصورات
نے کس قدر انتشار پھیلایا ہے۔

مندرجۂ بالا عبارت کا مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ فصاحت کا منطقی تصور کیا ہے اور غیر منطقی تصوّر کیا ہے؟ اگر لسانیات اور لغت میں منطق و فلسفہ کو مداخلت کا موقع دے دیا جائے تو سیکڑوں محاورے ترک کرنے پڑیں گے۔ مثلاً ہوا کھانا، غلط ہے۔ کیونکہ ہوا مونھ سے کھانے کی چیز نہیں ہے۔ دیوار میں پانی مر رہا ہے، غلط ہے۔ کیونکہ موت حیوانات پر واقع ہوتی ہے۔ ٹھوکر کھانا، فریب کھانا، غلط ہے۔ کیونکہ ٹھوکر اور فریب کوئی مٹھائی نہیں ہے۔ جام چھلک گیا غلط ہے۔ چھلکنے کی نسبت بجائے مظروف کے ظرف کی طرف غیر منطقی ہے۔ شہد کی مکھیوں نے کاٹ کاٹ کر سُجا دیا، غیر منطقی ہے۔ کیونکہ مکھیاں ڈنک چبھوتی ہیں۔ دانتوں سے نہیں کاٹتیں۔ ایسے سیکڑوں محاورے ہماری اردو زبان میں بلکہ دنیا کی اور زبانوں میں بھی رائج ہیں جو منطق کی رو سے غلط ہیں۔ رہا معیار کا منطقی اور غیر منطقی تصوّر۔ تو کیا آپ نے کوئی معیار قائم کیا ہے؟ اگر قائم کیا ہے تو اس کے منطقی اور غیر منطقی تصور کی وضاحت کی جائے۔

آگے لکھتے ہیں :-

"اصل مقصود یہ ہے کہ قاموس الاغلاط کو موضوع بنا کر
اردو میں لغت نگاری کے احوال دانداز کا اور غلطی و صحت اور
فصیح و غیر فصیح کے ٹھپا لگے ہوئے تصورات کا کچھ بیان کیا جائے"

ایک طرف تو فاضل مصنف ہر ایک غلط اور عوامی لفظ کے بارے میں یہ حکم لگاتے ہیں کہ بہر حال یہ بھی ایک لفظ ہے۔ اس کو بھی لغت میں آنا چاہیئے۔ اس کے اس تلفظ کو بھی مان لینا چاہیئے۔ پھر وہ ٹھپا لگے ہوئے تصورات کہاں سے آئیں گے؟ زبانوں کا تصورات سے کیا تعلق ہے؟ نیز ٹھپا کہاں لگتا ہے؟ وہ ٹکسال کہاں ہے؟

آگے لکھتے ہیں :۔

اس مضمون میں قاموس الاغلاط کے کچھ مندرجات پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کوشش کی گئی ہے کہ جن لفظوں کو مؤلفین قاموس الاغلاط نے غلط بتایا ہے یا جن کی مستعمل حرکات کو غلط لکھا ہے، ایسے الفاظ کے متعلق فارسی تصرفات کو یا اساتذۂ اُردو کے مختارات کو پیش کیا جائے۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ایسی تالیفات کے اکثر مندرجات، مفروضات پر مبنی ہیں۔ اور ایسی کتابوں کے مؤلفین نے زبان کے اصول ارتقا اور اس کے ناگزیر تقاضوں سے کم سے کم سروکار رکھا ہے۔

فاضل مصنف جو کچھ لکھتے ہیں بڑے طمطراق سے فلسفیانہ انداز میں لکھتے ہیں۔ زبان بھی فاضلانہ اور ادیبانہ ہے۔ بدیشی الفاظ بھی بہت زیادہ استعمال کیے ہیں۔ ہم جیسے موٹی عقل والے ہندوستانیوں کی سمجھ میں نہیں آتا، کیا کہنا چاہتے ہیں۔ زبانوں کے اصول ارتقا و کمال اور اسباب تنزل و زوال کیا ہیں؟ اور اصول ارتقا کے ناگزیر تقاضے کیا ہیں؟ سلیس اُردو میں کھول کر بیان کیا جائے اور ہماری معلومات میں اضافہ کیا جائے۔

زبان کی ہر قسم کی تبدیلی کا نام ارتقا رکھ دینا، یہ فلسفیانہ نظریہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ بہرحال ایسی کارروائیاں اصلاح و تہذیب کے دائرے میں نہیں آئیں بلکہ ادب کو فاسد کرتی ہیں۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے اختلاف رائے کا آپ کو اختیار ہے۔ میں نے سرسری طور پر کتاب کی ورق گردانی کی ہے اور جہاں کہیں اظہار خیال ضروری سمجھا بے تکلف لکھ دیا۔

عادی ص۵۰

فاضل مصنف نے لفظ عادی کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی، کلب حسین خاں نادر، شوق نیموی اور شوق قدوائی کے اقتباسات سے تائید حاصل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

لغت کے لحاظ سے عادی کے معنی دشمن یا دوڑنے والا (وغیرہ)

ہیں۔ خوگر کے معنی میں یہ لفظ مہند ہے اور مہند ہونے کی حیثیت سے
اردو میں خوگر کے معنی میں صحیح اور فصیح ہے۔ عربی لغت کے لحاظ
سے خوگر کے معنی میں صحیح لفظ معتاد ہے۔ اس کو مختلف معانی میں
استعمال بھی کیا گیا ہے۔ مگر اب اس کا چلن اٹھ گیا ہے۔

یعنی سب حضرات عربی کے لحاظ سے اس کو غلط مان کر مہند کی حیثیت سے جائز قرار دیتے ہیں۔ واضح ہو کہ یہ لفظ دو مادّوں سے آتا ہے۔ ایک مادّہ ع د و ہے۔ اس مادّہ کے کچھ مشتقات اردو میں استعمال ہوتے ہیں مثلاً، عداوت، عدوان، عدو، تعدی، متعدی۔ لفظ عادی اس مادّہ سے اسم فاعل ہے۔ آخر کی یے ساکن ہے جو تنوین آنے کی صورت میں ساقط ہو جاتی ہے۔ عادٍ ہو جاتا ہے۔ اس کی دال پر دو زبر اور دو پیش نہیں آتے۔ اس یے کی جگہ واؤ تھا۔ تعلیل میں واؤ کو یے سے تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے کئی معنی ہیں۔ دوڑنے والا، ظالم، دشمن وغیرہ۔ اس لفظ میں یے حروف اصلیہ میں داخل ہے۔

لیکن عادی جو خوگر کے معنی میں ہے اس کا مادّہ ع و د ہے۔ اس لفظ عادی میں یائے نسبتی ہے۔ حروف اصلیہ میں سے نہیں ہے۔ یہ یا مشدد ہے (اور عربی میں یائے نسبتی مشدد ہوتی ہے) اس پر تنوین رفعی، نصبی، جری تینوں آسکتی ہیں عادیٌّ عادیًّا، عادیٍّ۔ اقرب الموارد میں ہے العادیُّ نسبۃً الی العادۃ۔ سلیمان حلیم نے عادی اور عادتی دونوں لفظ دیئے ہیں۔ صاحب غیاث اللغات نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ اس مادہ کے بھی کچھ مشتقات اردو میں مستعمل ہیں۔ مثلاً عادت، عود، عائد، عید، معاد، عیادت، معاودت، اعادہ۔ مجرد میں اس کا اسم فاعل عائد ہے۔ اس میں ہمزہ کی جگہ واؤ تھا تعلیل میں واؤ مبدل بہمزہ ہو گیا۔ یہ مادہ باب افتعال میں جاکر اعتیاد بن گیا۔ اعتیاد کے معنی ہیں کسی کام کو عادت بنا لینا۔ (خو گرفتن) اس سے اسم فاعل اصل شکل میں معتود بروزن معتقد اور اسم مفعول بروزن معتبر تھا۔ تعلیل میں واؤ مکسور و مفتوح الف سے بدل گیا۔ اور دونوں یکساں بروزن ممتاز ہو گئے۔ عبارت کے سباق و سیاق سے معنی متعین ہونگے۔ کسی فعل کو بطور عادت اختیار کرنے والا، یا وہ فعل جس کو عادت بنا لیا جائے۔ معتاد کے دونوں معنی ہیں۔ اور لفظ عادی جو عادت کی طرف

منسوب ہے۔ اس کے بھی دونوں معنی درست ہیں۔ یہ نہ مہند ہے نہ مفرس ہے خالص عربی لفظ ہے۔

جن حضرات نے لفظ عادی بمعنی خوگر کو غلط قرار دیا انھوں نے اس کو ع د و سے مشتق سمجھا۔ اور فضول بحث میں الجھ گئے۔ تعجب ہے کہ شوق نیموی جیسے عربی کے فاضل محقق بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔

مشکور ص۵۴

مصنف زبان و قواعد لفظ مشکور کو بمعنی شاکر صحیح اور فصیح قرار دیتے ہیں اور تائید میں مولانا سید سلیمان ندوی کا اقتباس نقل کرتے ہیں :۔

عربی میں مشکور اس کو کہتے ہیں جس کا شکریہ ادا کیا جائے مگر ہماری زبان میں اس کو کہتے ہیں جو کسی کا شکریہ ادا کرے۔ اسی لئے بعض عربی کی قابلیت جتانے والے اس کو غلط سمجھ کر صحیح لفظ شاکر یا متشکر بولنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی یہ اصلاح شکریے کے ساتھ واپس کرنا چاہیے۔ (نقوش سلیمانی)

اس کے ساتھ پنڈت دتاتریہ کیفی کا اقتباس بھی نقل کیا ہے :۔

جب عادی اور مشکور مدتوں سے عادت گیرندہ اور احسان مند کے معنی میں استعمال ہو رہے ہیں اور متکلم اور سامع دونوں کا ذہن انھی معنی کی طرف جاتا ہے تو اب قاموس اور صراح سے فتویٰ لیکر ان الفاظ کو اردو سے خارج کرنے میں کیا مصلحت ہے۔ (منشورات)

واصف عرض کرتا ہے کہ جب کسی غلط لفظ کا متبادل موجود ہو اور صحیح و فصیح ہو تو حیرت ہے کہ اس غلط لفظ کو زبردستی کھینچ کر صحیح کی فہرست میں داخل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

لفظ مشکور کے متبادل کئی لفظ موجود ہیں اور اردو میں رائج ہیں۔ مثلاً ممنون، متشکر، شاکر، شکرگزار، احسان مند، مولانا سید سلیمان ندوی نے شاید اس وجہ سے خفگی کا اظہار کیا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی نے استعمال کیا ہے۔ مگر وہ بھی انسان تھے، سہو ہو گیا۔ اور زبان کے باب میں مولانا آزاد پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے ان کو تقریر میں لفظ مستقبل بفتح با بولتے ہوئے سنا ہے اور بار بار سنا ہے۔ اسی طرح ان کی زبان سے لفظ ملزم بفتح زا

اور لفظ متوفی بالف مقصورہ بھی سُنا ہے۔ تعجب ہے کہ انھوں نے لفظ مشکور کو کیوں جائز رکھا؟ مولانا موصوف نے اپنی ایک خاص زبان ایجاد کی ہے۔ فصحا کے نزدیک قابل استناد نہیں ہے۔

قاموس اور صراح سے فتوی لینے پر ہمیں اصرار نہیں۔ لیکن اگر فصاحت کا معیار صرف یہ ہے کہ سامع کا ذہن لفظ کے مدلول و معنی تک پہنچ جائے تو کیا فتوی دیتے ہیں آپ اس وقت؟ جب تانگے والا پکارتا ہے "آڈ ٹیسن کو" جاہل عورتیں ڈاکٹر کو ڈانگدر کہتی ہیں۔ مرزا غالب کے ہاں لمبر اور سکتر کے الفاظ ملتے ہیں۔ فصحا نے کیوں قبول نہیں کیے؟

مشکور کی طرح ایک لفظ مطلوب بھی ہے۔ "میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت بارگاہ خداوندی سے نیک مطلوب ہوں۔" شاید اس کو بھی طالب کے معنی میں آپ جائز قرار دیں گے؟

معتوب ص۵۷

فاضل مصنف نے لفظ معتوب کے بارے میں مولانا حالی کا ایک شعر نقل کیا ہے:-

"دوست اللہ کے ہیں ٹھیرتے معتوب وہاں
اور مسیحائے زماں ہوتے ہیں مصلوب وہاں

اس شعر میں لفظ معتوب پر مولانا حالی نے یہ حاشیہ لکھا ہے:-

صحیح لفظ معاتب ہے مگر اردو میں بجائے معاتب کے معتوب بولا جاتا ہے۔ جیسے بجائے معفو کے معاف۔ پس اردو میں یہی صحیح اور فصیح ہے۔"

واصف عرض کرتا ہے کہ لفظ معتوب کا مادہ ع ت ب ہے۔ مجرد میں اس کے مصدر کئی وزن پر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک وزن عتاب بھی ہے۔ اس کے معنی ہیں دوسرے سے ناراض ہونا۔ اس کے کسی فعل سے خفا ہونا۔ ملامت کرنا۔ معتوب اس کا اسم مفعول ہے اور اردو میں بھی اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ مادہ باب مفاعلہ میں جاکر معاتبہ بنا۔ عتاب باب مفاعلہ کا بھی ایک وزن ہے۔ یعنی عتاب، معتوب، اور معاتب دونوں کا مصدر ہے۔ اس کے معنی بھی وہی ہیں جو مجرد کے ہیں۔ یعنی معاتب اور معتوب دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ اور از روئے قواعد و لغت دونوں صحیح ہیں۔

مولانا حالی کو بڑی غلط فہمی ہوئی۔

رہی یہ بات کہ فرہنگ آصفیہ میں نہیں ہے تو کسی چیز کا عدم ذکر عدم شے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اگرچہ لطور لغت مستقل طور پر نہیں دیا لیکن معاتب کے معانی میں معتوب بھی لکھا ہے۔

معاف ص۵۷

اس کا مادہ ہے ع ف و۔ اس سے اسم مفعول معفوّ (بہ تشدید واو) ہے۔ باب مفاعلہ میں جا کر معافاۃ ہوا۔ اس کا اسم فاعل مُعافی (بضم میم وکسرۂ فاوسکون یا) اور اسم مفعول معافیٰ (بضم میم ودر آخر الف مقصورہ) اہل فارس نے اسم مفعول کے الف مقصورہ کو ساقط کر کے معاف بنا لیا۔ اور اس قسم کی تخفیف دیگر الفاظ میں بھی کی گئی ہے۔ مثلاً مداوا کہ اصل میں مداواۃ تھا۔ صاف کہ اصل میں صافی ہے۔

معاف کے معنی ہیں مستثنیٰ، بخشیدہ، برطرف کیا ہوا۔ اہل فارس نے صیغہ صفت پر یا و تائے مصدری بڑھا کر مصدر مُعافیت بنایا۔ ہم نے اپنے قاعدے سے یائے مصدری بڑھائی اور معافی بنایا۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ لفظ معاف غلط ہے یہاں بھی مولانا کو غلط فہمی ہوئی۔ معاف اور معفو دونوں از روئے لغت درست ہیں۔

اور اگر یائے ساکن والے لفظ معافی کو بفتحہ میم پڑھا جائے تو معفو کی جمع مکسر ہو گا۔ تنوین آنے کی صورت میں یے ساقط ہو جاتی ہے۔ مَعافٍ، صافٍ۔

راشی ص۶۶

فاضل مصنف لکھتے ہیں:۔

"عام طور پر لوگ رشوت خور شخص کو "راشی" کہتے ہیں۔ اور لفظ مرتشی سے عام لوگ واقف نہیں۔ نہ اس معنوی فرق سے واقف ہیں۔ اور ناواقف ہی رہیں تو اچھا ہے"۔

فاضل مصنف عوام کی روش سے اس قدر متاثر اور خائف ہیں کہ امنّا وصدقنا اور تسلیم کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں پاتے۔ یہ منطقی تصور ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ کسی لفظ کی صحت و عدم صحت سے عوام کا ناواقف رہنا اچھا کیوں ہے؟

بہر حال لفظ راشی کو فصاحت کی سند دینے کی ضرورت نہیں۔ رشوت ستان

رشوت خور متبادل الفاظ موجود ہیں۔

رِدّی ص۶۷

فاضل مصنف نے لفظ ردی (بدال مشدد) کو اردو کا تصرف کہکر اس کو مہند قرار دیا ہے۔ عربی میں ردٌّ بدال مشدّد اور ردیٌ بروزن جلیس دونوں لفظ موجود ہیں اور مترادف ہیں۔ بمعنی ناکارہ فاسد، رجکٹ۔ عربی لغت میں ہے شیٌٔ ردٌّ ای ردیٌ۔ ہم نے صرف اتنا تصرف کیا ہے کہ ردّ کے آگے ایک حرف یا بڑھا کر ردی بنا لیا۔ اگر اس کو یائے تانیث سمجھ لیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ معنی میں بھی کوئی فرق نہیں۔ دونوں صحیح لفظ ہیں۔

ذہانت ص۶۹

فاضل مصنف لکھتے ہیں :۔

یہ لفظ چونکہ عربی کے کسی لغت میں نہیں پایا جاتا، اس لئے مؤلفینِ قاموس نے اس کو ترک کرنے کی فرمائش کی ہے۔ کیسا اچھا اور جامع لفظ ہے اور اس کو گردن زدنی قرار دیا گیا ہے۔ مولانا نظم طباطبائیؔ نے بھی اپنے مقالے "ادب الکاتب والشاعر" میں ذہانت کا شمار ان الفاظ میں کیا ہے جن سے دامن بچانا واجب ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ فیلن وپلیٹس نے بھی اس کو شامل لغت نہیں کیا ہے۔ نور میں یہ لفظ موجود ہے۔ لیکن اسناد مذکور نہیں۔ آگے لکھتے ہیں :۔

ذہانت ہی کی قبیل کا ایک اور لفظ بادشاہت ہے۔ مؤلفین قاموس نے اس کو بھی عوام سے متعلق کر دیا ہے۔ " بادشاہت عوام بادشاہی کی جگہ کہتے ہیں" (قاموس) صاحب آصفیہ نے بھی اس کو عوام کا لفظ بتایا ہے۔ یہ فتوا بالکل صحیح نہیں۔ یہ لفظ مستعمل خاص وعام ہے۔

واصف عرض کرتا ہے کہ عربی میں یہ لفظ موجود ہے۔ اس کا مادہ باب فتح اور رباب کرم سے آتا ہے۔ باب فتح کا مصدر ذَھنٌ بفتح اول اور رباب کرم کا مصدر ذَھَانَۃٌ بفتح اول۔ اس کے معنی ہیں سمجھنا اور یاد رکھنا۔ ذِھنٌ بالکسر اس ملکہ اور قوت کا اسم ہے۔ اقرب میں ہے الذھن، الفھم وحفظ، القلب الخ۔ لفظ ذہانت بالکل عربی ہے

عوام نے صرف اتنا تصرف کیا ہے کہ ذہانت بفتح اول کے بجائے بکسر اول بولتے ہیں! البتہ ایک لفظ ہم نے ذہن سے ذہنیت خود بنایا ہے جس کے معنی انداز فکر کے ہیں۔ ذھین صیغہ صفت مشبہ ہے۔ لفظ ذہانت سے دامن بچانے کا حکم کیوں دیا گیا؟ کس نے بہکادیا کہ عربی کے کسی لغت میں نہیں پایا جاتا۔

بادشاہت ص۶۹

اس کا متبادل بادشاہی اور سلطانی موجود ہے۔ لہذا بادشاہت کی فصاحت پر اصرار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

باب مفاعلہ

فاضل مصنف "قاموس الاغلاط" پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

اس میں شک نہیں کہ عربی کے لحاظ سے اس وزن (مفاعلہ) پر آنے والے الفاظ بفتح حرف چہارم ہی صحیح ہیں۔ مگر اردو میں ایسے اکثر الفاظ بکسر حرف چہارم زبان زد ہیں۔ ان کو اگر لغت کے مطابق ادا کیا جائے تو ثقالت کا شدید احساس ہوگا۔ کوشش کر کے کچھ رک کر اور گفتگو کی روانی کو ختم کر کے بفتح حرف چہارم بولا جاسکتا ہے مثلاً ایک مصدر ہے معالجہ۔ علاج معالجہ، زبان زد مرکب ہے۔ اب اس کو لغت کے مطابق بفتح حرف چہارم بول کر دیکھیے۔ روانیٔ کلام خود بخود مجروح ہو جائیگی۔

عوام کی روش کا ایسا رعب چھایا ہوا ہے کہ جہاں صحیح و غلط یا فصیح و غیر فصیح کا خیال آیا فوراً روانی کلام مجروح ہوئی۔ یعنی لفظ کی صحت و فصاحت کے مقابلے میں روانیٔ کلام زیادہ قیمت رکھتی ہے۔

باب مفاعلہ کے وزن پر جو الفاظ اردو میں رائج ہیں ان میں سے بعض بکسرۂ حرف چہارم بولے جاتے ہیں۔ خاصکر وہ الفاظ جن میں حرف چہارم ہمزہ یا عین یا ہائے ہوز یا حائے حطی ہو جیسے مطائبہ، مباحثہ، مجاہدہ، مشاہدہ، معاہدہ، مضائقہ، معائنہ۔ اور بعض ایسے ہیں جن میں حرف چہارم موقوف بولا جاتا ہے۔ جیسے مبالغہ، محاربہ، محاسبہ مراقبہ، معالجہ، محاصرہ، مناظرہ، موازنہ، مناقشہ، مغالطہ، مقابلہ، مکالمہ، مجادلہ۔

اور بعض ایسے ہیں جو خاص علمی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں وہ بفتح حرف چہارم بولے جاتے
ہیں۔ جیسے مرافعہ، معانقہ، معاشرہ، مطالعہ۔
لیکن اس وزن میں جو الفاظ لمبی ت سے لکھے جاتے ہیں وہ زیادہ تر بفتح حرف چہارم
بولے جاتے ہیں۔ جیسے مراسلت، مخاطبت، مصاحبت، مکاتبت، مناسبت، مسامحت،
مصالحت وغیرہ۔
عوام جس طرح بولتے ہیں بولنے دیجئے۔ لغت تو ہوتا ہی اس لئے ہے کہ اگر کسی
لفظ کی صحت و عدم صحت، فصاحت و عدم فصاحت میں شک ہو تو لغت میں دیکھکر معلوم
کر لیا جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو وہ لغت رہنما نہیں ہوگا گمراہ کن ہوگا۔

تعینات ص۷۵

فاضل مصنف لکھتے ہیں:۔
> تعیّن اور تعیین عربی کے دو مصدر ہیں۔ ان کی جمع تعینات اور
> تعیینات آتی ہے۔ ان کے انداز پر دو نئے لفظ بن گئے۔ تعینات اور
> تعیناتی۔

شاید فاضل مصنف کا یہ خیال ہے کہ تعیّن بروزن تأثر کی جمع تعینات بگڑ کر بروزن
رسیدات ہوگئی۔ اور تعیین بروزن تاثیر کی جمع تعیینات سے تعیناتی بروزن رسیداتی بنا۔
صاحب نور اللغات نے لکھا ہے کہ اردو میں تعینات بروزن رسیدات بمعنیٔ مقرر و مسلط مستعمل
ہے۔ اس پر فاضل مصنف اپنی رائے لکھتے ہیں:۔
> مگر عام بول چال میں تعینات کی عین، ی، سے اس طرح مخلوط
> ہو جاتی ہے کہ علیحدہ آواز نہیں دیتی۔ اس لئے بروزن رسیدات سے
> تلفظ کی صحیح طور پر نشاندہی نہیں ہوتی۔ یہ لفظ بروزن خیرات بولا جاتا
> ہے اور یہی فصیح تلفظ ہے۔

یہ آتیج بھی قابل داد ہے۔ عوام کے تلفظ کی نشاندہی کو فصاحت کا معیار قرار دیا گیا
ہے۔ اس معیار پر جانچیے: شمع بروزن دفا بولا جاتا ہے۔ یہی تلفظ فصیح ہے۔ "اک شمع
رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے"۔ مرزا غالب کے مصرع میں شمع کا تلفظ غیر فصیح۔ جمعدار
غیر فصیح جادار فصیح۔ تغلق آباد غیر فصیح تکلاباد فصیح۔ فتح گڈھ غیر فصیح پھتے گڈھ فصیح

زور آور سنگھ غیر فصیح جور آور سنگھ فصیح ۔ مشعل غیر فصیح مشال فصیح ۔ شاہجہانپور غیر فصیح سیجان پور فصیح ۔ فرخ آباد غیر فصیح پھر کاباد فصیح ۔

واضح ہو کہ لفظ تَعَیُّنَات کا باب تفعل سے کوئی تعلق نہیں ۔ تعیین اور تمییز باب تفعیل کے مصدر ہیں ۔ ان دونوں میں ایک "ی" کی تخفیف غلط العام میں داخل ہے تعین بروزن متین کی جمع بنا کر اردو والے استعمال کرتے ہیں ۔ تعینات ایک لفظِ مفرد کی حیثیت حاصل کرچکا ہے ۔ اس پر یائے مصدری بڑھا کر تعیناتی بنا لیتے ہیں ۔ اور کبھی اس یا کو یائے نسبتی قرار دے کر صفت کے معنی مراد لیتے ہیں ۔ یعنی وہ شخص جسکو ڈیوٹی پر لگایا جائے یہ معنی صاحب فرہنگ آصفیہ نے نہیں لکھے ۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے وَقَیَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ کا ترجمہ کیا ہے " اور لگا دیئے ہم نے ان پر تعیناتی "۔

جو لوگ تعینات کو بروزن خیرات بولتے ہیں (یا بولتی ہیں) ہم اردوئے معلیٰ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں ۔

انکساری ص۸۴

فاضل مصنف لکھتے ہیں :-

" طغیانی اور خلاصی کی طرح انکساری بھی اردو میں قبول عام کی سند پا چکا ہے ۔ اور اب یہ لفظ بھی ایسے دوسرے الفاظ کی طرح بالکل صحیح ہے اور اسے لغت میں باقاعدہ جگہ ملنا چاہیے "۔

واضح ہو کہ انکساری ، انتظاری ، یہ دونوں لفظ غلط العام سے نکل کر غلط العوام میں جا چکے ہیں ۔ پس لائق ترک ہیں ۔

اندازاً ، نمونتہً ص۸۵

لکھتے ہیں :- آصفیہ ، نور ، امیر اللغات کسی میں یہ لفظ موجود نہیں ۔ آگے لکھتے ہیں :-

راستے میں کوئی صاحب ملیں اور وقت پوچھیں ، گھڑی پاس نہو اور آپ ان سے کہیں کہ " تخمیناً دو بجے ہونگے " تو یقین کیجیے کہ وہ صاحب اگر زبان سے کچھ نسبت رکھتے ہونگے تو اپنا سوال بھول کر اس تخمیناً پر آپ کا منہ دیکھتے رہ جائیں گے ۔ آخر میں لکھتے

ہیں :- یہ دونوں لفظ چونکہ اُردو میں مستعمل ہیں اور بکثرت اس لئے اب ان کو بھی لغت میں مناسب طور پر جگہ ملنا چاہیے۔

فاضل مصنف بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے۔ اگر مجھ سے کوئی شخص وقت پوچھے اور میں کہوں کہ تخمیناً (یا اندازاً) دو بجے ہونگے تو سامع اگر زبان سے کچھ بھی مناسبت رکھتا ہے تو یقیناً اپنا سوال بھول کر میرا مونھ دیکھتا رہ جائے گا اور سوچے گا کہ یہاں یہ لفظ بڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا تخمیناً (یا اندازاً) بڑھائے بغیر جملہ مکمل نہیں ہوتا؟

لیکن اگر میں کہوں "کوئی دو بجے ہونگے" تو وہ مطمئن ہو جائیگا اور اس کو اُن عربی فارسی الفاظ کی تحقیق کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ دیکھیے کیسا ہلکا پھلکا جملہ ہے۔ یہاں لفظ "کوئی"، "تخمیناً" کے معنی میں ہے اور خود "ہونگے" کا صیغہ بھی یہی بتاتا ہے کہ آپ اندازے سے کہہ رہے ہیں۔

بھاری بھاری الفاظ کلام میں لا کر بلا ضرورت کلام کو طول دینا یا غلط الفاظ کو فصاحت کی سند دیکر اصرار کرنا کہ چونکہ ہم نے ان کو سند دیدی ہے۔ اس لئے لغت میں ان کو عزت کی جگہ ملنی چاہیئے۔ یہ کوئی ادبی خدمت نہیں ہے۔

ہاں اگر کوئی ہستی ایسی ہے جس سے آپ زیادہ دیر تک ہم کلام رہنا چاہتے ہیں۔ تو یوں کہیے :- میرے پاس گھڑی نہیں ہے، اندازے سے کہہ سکتا ہوں، تقریباً دو بجے ہونگے، بالکل صحیح معلوم کرنا ہو تو آگے ریلوے اسٹیشن آ رہا ہے، وہاں دیکھ لیجیے گا۔

خرّاج ص ۹۵

فاضل مصنف لکھتے ہیں :-

"اُردو والوں نے خرچ سے خرّاج بنا لیا ہے عربی الفاظ کے قیاس پر۔ یہ لفظ استعمال میں آتا رہتا ہے۔ آصفیہ و نور دونوں میں یہ لفظ موجود نہیں۔ بعض لوگ اب تک اس لفظ کو مبتذل سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ لفظ جس مفہوم کو جس ہمہ گیری کے ساتھ ظاہر کرتا ہے وہ دوسرے الفاظ سے شاید ہی ادا ہو سکے مرغن، نوق البھڑک، اور مدمغ وغیرہ کی طرح اس لفظ کو بھی صحیح مان لینا چاہیے اور لغت میں جگہ دینا

چاہیئے۔

واصف عرض کرتا ہے۔ دراصل عربی میں خرج بفتح اول و سکون ثانی، جیم سے ہے۔ اِس کے معنی وہی ہیں جو خرچ کے ہیں۔ اس کا ضد دخل بمعنی آمدنی۔ مصدر اس کا خروج ہے بمعنی نکلنا۔ خرج کی جمع اَخراج بفتح اول۔ باب افعال میں جا کر متعدی بنتا ہے۔ اِخراج بالکسر کے معنی ہیں نکالنا، ظاہر کرنا اور خراج ادا کرنا۔ اگر لفظ اخراجات کو بکسر اول پڑھا جائے تو اس مصدر متعدی کی جمع اور اگر بفتح اول پڑھا جائے تو خرج کی جمع الجمع سمجھا جائے گا۔

مجرد میں مصدر لازم (خروج) سے خرّاج صیغۂ مبالغہ ہے اس کے معنی ہیں کثیر الخروج یعنی بہت زیادہ نکلنے والا۔

اُردو والوں نے یہ تصرف کیا کہ خرج کے جیم کو "چ" سے بدل دیا۔ ایسے الفاظ جن میں ہم نے لفظی تبدیلی کی ہے معنی تبدیل نہیں کیے وہ مؤرد غیر تام ہیں۔ (دیکھو اردو مصدر نامہ صفحہ ۲۶)

یہاں تک تو کوئی مضائقہ نہ تھا مگر مؤرد کرنے کے بعد عربی کے قاعدے سے خوش طبعی کے طور پر صیغۂ مبالغہ (خرّاچ) بنا یا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے دھکیلنا سے دھکّال اور لپکنا سے لپّاک بنا لیا جائے۔ ایسے الفاظ سنجیدگی میں نہیں بولے جاتے۔ اس کا متبادل لفظ خرچیلا موجود ہے اور فصیح ہے۔

اور بھی ایسے مضحکہ انگیز الفاظ اور ترکیبیں ہیں جو یا تو کم علم منشیوں، عرائض نویسوں یا دیہاتی معلموں نے ناواقفیت کی بنا پر یا تعلیم یافتہ لوگوں نے مذاق کے طور پر ایجاد کیں، ان کو فصاحت سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ مثلاً فوق البھڑک، شدید البڑک مجرب، ملبب، مزیب، مزلف، دام نوازشکم، مدمغ، عندالدرخواست حسب الخواہش، متڑش، متّاد، چلیدن وغیرہ۔

مذاق اور دل لگی کے لئے ہم خود ایسی ترکیبیں وقتی طور پر گھڑ لیتے ہیں۔ جیسے قریب الآ، قریب الجا، قریب البیٹھ، کھانا کھائیدہ خواہم لیٹیڈ، فارسی را ٹانگ می توڑم تا کہ او لنگڑی شود۔ ایسی گنگا جمنی ترکیبوں کی مثالیں خسرو، انشا اور دیگر شعراء کے کلام میں بھی ہیں یہ مجلسی خوش وقتیوں کے لئے تصنیف کی گئی ہیں کیا یہ دل لگی

قابل استناد ہے ؟ بہارعجم میں انا الدوست اور انا الیار کے الفاظ بھی دیئے ہیں۔

اعراف ص ۹۹

فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ :-

قاموس الاغلاط ، فرہنگ آصفیہ ، امیر اللغات ، نور اللغات -
ان سب میں اس لفظ کو صرف بفتح اول لکھا گیا ہے۔ اصل کے
لحاظ سے یہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن بقول اثر لکھنوی مرحوم " اُردو
میں بکسر اول بولتے ہیں۔ ہمارا لہجہ اسی کا متقاضی ہے۔ (رسالہ
الحمرا لاہور جنوری ۱۹۵۳ء) حرکت کا یہ اختلاف اُردو میں ہی نہیں
جدید فارسی میں بھی ہے۔ حییم نے اپنی لغت میں اس کو بکسر اول
لکھا ہے "

واضعف عرض کرتا ہے :- یہ لفظ بفتح اول ہے اور بالفتح ہی بولا جاتا ہے -
اقرب الموارد ، المنجد اور لغات حدیث میں بھی بفتح اول ہے۔ اعراف اسلامی
روایات کی رو سے وہ مقام ہے جہاں ایسے لوگوں کو رکھا جائے گا جو نہ جنت کے مستحق
ہونگے نہ دوزخ کے۔ مصرع ہے — از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است -
اقرب الموارد ، المنجد دونوں کے مصنف عیسائی ہیں ، بالفتح ہی لکھتے ہیں، ترجمہ
کرتے ہیں - سُورٌ بین الجنة والنار - سلیمان حییم یہودی ہے۔ اس نے اعراف
کو بالکسر لکھا ہے اور معنی بھی غلط کیے ہیں۔ لکھتا ہے جنت اور دوزخ کے بیچ کی دیوار -
واضح ہو کہ سُورٌ کے صحیح معنی چار دیواری ، فصیلِ شہر ، احاطہ یا باؤنڈری کے ہیں۔ علاوہ
ازیں سلیمان حییم نے جو بہت سے معنی لکھے ہیں وہ اسرائیلی روایات پر مبنی ہیں -

الاعراف قرآن مجید کی ایک سورۃ کا نام بھی ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ
علَم ہے اور علَم کی حرکات و تلفظ میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اگر آپ کا لہجہ کسرہ کا
متقاضی ہے تو اعمال ، اعداد ، اعضا ، اعصاب ، میں آپ کا لہجہ کیا ہوگا ؟

ارنی ص ۱۰۰

لفظ ارنی کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ بکسر را اور بسکون را دونوں طرح صحیح
ہے۔ سکون را کی تصدیق کے لئے مخزن اسرار نظامی کا شعر پیش کیا ہے :-

موسیٰ ازیں جام تہی دید دست شیشہ بکف بپایۂ ارنی شکست

آگے مرزا غالبؔ کے ایک خط میں سے اقتباس پیش کیا ہے۔ "اگر تقطیع شعر مساعدت کرجائے اور ارِنی بروزن جپنی گنجائش پائے تو نعم الاتفاق۔ ورنہ قاعدۂ تصرف مقتضی جواز ہے۔" (ادبی خطوط غالب)۔

عربی کے مفرد الفاظ جو قرآن میں بھی آئے ہوں (یا نہ آئے ہوں) ہم اپنی عام بول چال میں بتصرف بھی استعمال کرتے ہیں اور فصیح قرار دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک لفظ میت ہی کو لیجیے۔ بفتح الیاء عام بول چال میں فصیح ہے۔ لیکن اگر ہم قرآن کی آیت کو شعر میں لائیں تو میت کا عزت قدرت مشیئت کے ساتھ قافیہ باندھنا قطعاً غلط ہوگا۔ مثلاً :-

ہے موت نبی کو بھی بقانون مشیئت ؛ قرآن میں ارشاد ہوا اِنَّكَ مَيِّت

ایسے ہی بہت سے الفاظ کلمہ، ثمرہ، حرکت، برکت وغیرہ ہیں۔

قرآن کا اطلاق ہر ایک جملے اور ہر ایک آیت پر ہوتا ہے۔ مرکب تام کو جملہ اور کلام کہتے ہیں۔ جملوں کا مرتب مجموعہ عبارت کہلاتا ہے جس کو اصطلاحاً نظم قرآن کہتے ہیں۔ قرآن کے کسی جملے میں تصرف اور تبدیلی کرنا تحریف ہے اور تحریف ایک بڑا جرم ہے۔

اِنَّكَ میت ایک مکمل جملہ اسمیہ خبریہ ہے۔ یہ ایک جملہ بھی قرآن اور خدا کا کلام ہے۔ اسی طرح اَرِنی ایک مکمل جملہ فعلیہ انشائیہ ہے، اس پر بھی قرآن اور کلام الٰہی کا اطلاق کیا جائیگا۔ غرضکہ نظم قرآن میں کسی قسم کی تبدیلی ہرگز جائز نہیں۔ جن لوگوں نے ارنی کو مفرد قرار دیکر تصرف کیا یعنی بسکون را لکھا اُن کا یہ تصرف ناقابل استناد ہے۔ خواہ وہ کوئی ادیب ہوں یا شاعر یا امام و مجتہد۔

نشتر، درود، رعونت، عصمت، جمہور ص۱۱۱ و ۱۱۹

مذکورہ الفاظ کا فتحۂ اول عوام کے حوالے کیا جاچکا ہے۔ اب صحیح بولے جاتے ہیں۔ یعنی درود، رعونت اور جمہور بضم اول۔ نشتر اور عصمت بکسر اول صحیح اور فصیح ہیں۔

خلجان ص ۱۲۸

اس لفظ کو عوام نہیں بولتے۔ پڑھے لکھے اور شائستہ طبقے میں بولا جاتا ہے اور بفتحتین بولا جاتا ہے۔ اگر کوئی بسکون ثانی کہے تو غلط اور قابل رد۔ اُردو میں اس کے متبادل الفاظ یہ ہیں :۔ تردد۔ شک، دُوگدا۔ تذبذب پس وپیش وغیرہ۔

خفگی ص ۱۲۸

فاضل مصنف نے بسکون ثانی کی سند میں حالی کا شعر پیش کیا ہے :۔

ماں کی خفگی سے ہے بہت ڈرتی　　اس کے تیور ہے دیکھتی رہتی

مگر داغ نے خفگی اور خفقان کو بفتحتین باندھا ہے۔ مرزا غالب نے خفقانی بفتحتین باندھا ہے۔ ادب و شعر میں بسکون ثانی کی گنجائش نہیں۔

قرآن ص ۱۳۲

فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ قُرآن بروزن زبان بھی صحیح ہے۔ اور تائید میں بہت سی سندیں پیش کی ہیں۔ مثلاً شعرائے فارسی، فرخی، خاقانی، قاآنی لبیبی، منوچہری، ناصر، سنائی۔ اور شعرائے اردو میر تقی میر، سوز، انشا، اسد قائم، نظیر اکبر آبادی وغیرہ

واصف عرض کرتا ہے کہ معرفہ کی اقسام میں قوی تر قسم علم ہے۔ یعنی اشخاص و مقامات یا خاص اشیا کے نام۔ علم میں تصرف نہایت ناگوار اور معیوب ہے۔

ایک صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ بہت دولت مند، شایستہ تعلیم یافتہ ایک بہت بڑی تجارتی فرم کے مالک، نام ان کا گھیس محمد ہے۔ میں نے ان سے کہا آپ کا نام غوث محمد ہوگا۔ فرمایا۔ نہیں۔ یہی نام میرے ماں باپ نے رکھا ہے اور اب بدلا نہیں جا سکتا۔ تمام سرکاری کاغذات اور دستاویزوں میں یہی درج ہے۔ پھر یہ کہ ماں باپ کے رکھے ہوئے نام کو میں بدلنا بھی نہیں چاہتا۔

اگر کسی کا نام گھسیٹا، یا کھچیڑو ہے تو کسی کو حق نہیں کہ اس کو گھسیٹ یا کھچیڑ کہہ کر پکارے۔ اگر کوئی شخص حفیظ کو ہپیج یا رشید کو رسید یا لکھنؤ کو نکھلئو یا صاحب آباد کو سہیبا باد کہے تو کیا اس کو فصاحت کی سند سے نوازا جائے گا؟

جب بھونڈے سے بھونڈے نام میں تصرف کرنے کا کسی کو حق نہیں تو اللہ رب العزۃ

کے رکھے ہوئے نام میں تصرف کرنے کا حق کیونکر حاصل ہو گیا؟ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب کا نام قرآن بروزن فرقان رکھا ہے۔ جن لوگوں نے بضرورت شعری اس میں تصرف کیا ہے اُن سے پوچھنا چاہیے کہ آپکو شعر کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ غرضکہ یہ تصرف قابل رد ہے۔ خواہ کسی بڑے سے بڑے استاد نے کیا ہو۔

فہمائش، پیدائش، زیبائش، رہائش، گرمائش ص۱۳۵

فاضل مصنف نے فہمائش کے بارے میں مرزا غالب کا ایک اقتباس دیا ہے:۔

> فہمیدن فارسی الاصل نہیں ہے۔ مصدر جعلی ہے۔ فہم لفظ عربی الاصل ہے۔ اس قاعدے میں یہ کلیہ ہے کہ لغت اصل عربی آخر کو امر بن جاتا ہے۔ حاصل بالمصدر فہمش اور طلبش ہونا چاہیے فہم تھا۔ صیغہ امر فہمد سے نکلا تھا۔ الف اور ی کہاں سے آیا۔ فہمائے تو نہیں جو فہمائش درست ہو (بنام میر مہدی مجروح)

واضح ہو کہ لفظ فہمایش، فہمیدن سے نہیں بلکہ اس کے متعدی فہمانیدن سے حاصل مصدر ہے اور متعدی ہی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اُردو والوں نے خلاف قیاس بنالیا ہے۔ لفظ پیدائش فارسی میں مستعمل ہے۔ اسم جامد سے بنایا ہے۔ زیبائش اُردو کا تصرف ہے، فارسی میں زیبائی ہے۔ الفاظ مذکورہ کی فصاحت قابل تسلیم ہے۔ مگر رہائش کو ذوق سلیم قبول نہیں کرتا۔ یہیں دہلی میں گھوسی وغیرہ رہاست اور رہاست بولتے ہیں ان کو بھی فصیح تسلیم کرنا پڑے گا۔ لفظ گرمائش کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> "گرمائش نیا لفظ ہے۔ میں نے اس کو ایک معروف کپڑا مل کے اشتہار میں سنا تھا غالباً پچھلے سال یعنی ۱۹۷۳ء میں "وگیاین کار یہ کرم" میں۔ اس مل کے اونی کپڑوں کے اشتہار میں "گرمائش اور آرام کے لئے" کا ٹکڑا بار بار سننے میں آتا تھا۔ مجھے یہ لفظ بہت دلچسپ اور کارآمد معلوم ہوا اسکو بھی پیدائش اور رہائش کی طرح صحیح مان لینا چاہیے۔ گرما سے گرمائش بخوبی بن سکتا ہے اور نہایت خوبی کے ساتھ مفہوم کو ادا کر سکتا ہے۔ نئے لفظ اس طرح بھی بنتے ہیں۔"

جی ہاں! بنتے ہیں۔ کوئی قدردان ہونا چاہیے۔ سرمائش، برکھائش، دھوکائش،

دہکاپش، کوڑاپش، دھکاپش، بہکاپش، سچاپش، پہناپش، ننگاپش، ہلکاپش، پٹاپش، نرماپش، موٹاپش، پتلاپش، گاڑھاپش، اونچاپش، نیچاپش، گولاپش۔ بے شمار الفاظ بن سکتے ہیں۔ اُردو لغت کے لئے بڑا قیمتی سرمایہ فراہم ہو سکتا ہے۔

اُدبا و شعرا اور ماہرین لسانیات کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ انڈسٹری (یعنی لغت سازی) بھی کارخانہ داروں اور صناعوں کے سپرد کر کے آپ کو اس دیس سے کوچ کر جانا چاہیے۔ آہ! مظلوم اُردو! —— لیکن ——

وہم بیچارگی ہے ننگِ حیات　　جیتنی ہے ابھی تو جنگِ حیات

مسرت، محبت، عنقا ص ۱۴۱

مسرت کو پڑھے لکھے لوگ بالضم نہیں بولتے۔ پنجاب کی نصابی کتابوں میں جہاں کہیں یہ لفظ آتا تھا اس پر قصداً بڑی پابندی کے ساتھ موٹا سا پیش لگایا جاتا تھا اور موسم کے سین کے نیچے موٹا سا زیر لگا ہوتا تھا۔ اور اب تو شایستہ طبقے میں عنقا اور محبت کو بھی بالفتح بولا جاتا ہے۔ بہر حال تینوں لفظ بالفتح ہی صحیح اور فصیح ہیں۔

مُہوس ص ۱۴۲

فاضل مصنف لکھتے ہیں :-

"آصفیہ میں مہوس کو کیمیا گر کے معنی میں اُردو لکھا گیا ہے اور یہ درست ہے کیونکہ کیمیا گر کے معنی میں یہ اردو نژاد ہے۔ نور میں مہوس کو صحیح طور پر اردو لکھا گیا ہے"

واصف عرض کرتا ہے کہ یہ مادّہ عربی میں موجود ہے۔ ھَوْس بروزن غور۔ معنی کوٹنا کچلنا۔ روندنا۔ جلدی جلدی کھانا۔ اختلاط و فساد یعنی آپس میں گتھ جانا وغیرہ مھوِّس باب تفعیل سے اسم فاعل ہے۔ کیمسٹری میں مختلف چیزیں کوٹ کر، پیس کر، گھول کر ملائی جاتی ہیں اسی مناسبت سے کیمیا گر (یا کیمسٹ) کو مہوس کہا گیا۔ یہ خالص عربی لفظ ہے۔ مفرس یا مؤرد نہیں ہے۔ مقدمہ ابن خلدون میں علم کیمیا کے باب میں یہ لفظ نظر سے نہیں گذرا۔ غالباً ہندوستانی کیمسٹوں نے یہ اصطلاح تجویز کی ہوگی۔

لفظ ہوس بروزن طلب کے معنی ہیں کھانے کا ہوکا۔ حرص شدید۔ مالیخولیا یا سنک۔ (لسان العرب) یہ لفظ عربی ہے فارسی نہیں ہے۔ بعض لوگ ہوس کو بکسرۂ واؤ

بولتے ہیں وہ غلط اور قابل ترک ہے۔

مہوّس بفتحہ واؤ بروزن منور اسم مفعول ہے اس کے معنی ہیں سنکی خفیف العقل ہوس زدہ، مریض حرص۔

واضح ہو کہ آصفیہ نے لفظ مہوّس بکسرۂ واؤ بروزن مؤثر جو اسم فاعل ہے نہیں لکھا۔ بس ایک مہوّس بفتحہ واؤ لکھ کر دونوں معنی اسی میں لکھ دیئے۔ اور اس کو عربی بھی قرار دیا اور اردو بھی۔ اور پھر آخر میں مفرس بھی قرار دے دیا۔ یہ بڑا بھاری سہو ہے۔

دمشق ص ۱۴۶

لکھتے ہیں کہ "لفظ دمشق اردو میں بالعموم بفتح اول وکسر ثانی مستعمل ہے اور اردو میں صرف یہی تلفظ قابل تسلیم ہے۔ میم کی حرکت میں ذرا سا اختلاف ہے۔ اس کو بالفتح اور بالکسر دونوں طرح کہا گیا ہے۔ اس سارے اختلاف کو فارسی و عربی سے متعلق سمجھنا چاہیئے اور اردو میں اس کو صرف بفتح اول وکسر ثانی ماننا چاہیے"۔

واضح ہو کہ یہ لفظ تمام لغات میں بھی اور معجم البلدان میں بھی بکسر اول ہے۔ میم مفتوح اور مکسور دونوں طرح مستعمل ہے۔ یہ ملک شام کا مشہور شہر ہے اور چونکہ علم ہے اس لئے ہمیں یا اور کسی کو اس میں تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں۔

خسرو ص ۱۴۶

فاضل مصنف اس لفظ کی حرکات کے بارے میں لغات کے اختلافات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

اردو میں صورت یہ ہے کہ زبانوں پر بضم اول وسوم ہے نظم میں اس کو بفتح سوم ضَو وغیرہ کا ہم قافیہ کیا گیا ہے۔ گویا حرف اول پر ہر حال میں پیش رہتا ہے اور حرف سوم پر اکثر پیش اور کمتر زبر آتا ہے۔ ضرورت شعری کے نتیجے میں۔ اردو میں اسی صراحت کے ساتھ اس لفظ کی ان دونوں صورتوں کو تسلیم کر لینا چاہیے یکسر اول جیسا کہ آصفیہ میں لکھا ہے اردو میں مستعمل نہیں۔ اس کو فارسی

سے متعلق سمجھنا چاہیے۔
واصف عرض کرتا ہے کہ یہ لفظ عربی و فارسی لغات میں بضم اول و فتح را ہے۔ بضم اول وضم را پڑھے لکھے لوگ نہیں بولتے۔ سلیمان حییم نے بھی بضم اول و فتح را لکھا ہے۔ کسریٰ اسی کا معرب ہے۔ یہ دلیل ناقابل توجہ ہے کہ کسریٰ بالکسر ہے۔ اس لئے خسرو بھی بالکسر ہونا چاہیے۔ بہرحال یہ بھی علم کے دائرے میں ہے۔

کَیفیت صـ ۱۴۶

فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ " اُردو میں اس لفظ کو بکسر نون مشدد ہی بولا جاتا ہے۔ یہ تلفظ خواہ عربی و فارسی لغات کے اندراجات کے خلاف ہو مگر اردو کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے۔
واصف عرض کرتا ہے کہ لفظ کیفیت بضم اول و بکسر اول بروزن قدرت و فطرت دونوں صحیح ہیں۔ کیسا ہلکا پھلکا تلفظ ہے۔ مشدد کرکے خواہ مخواہ ثقیل بنانے کی کیا ضرورت؟ ایک خاص طبقے کا لفظ ہے۔ اصلاح کچھ مشکل نہیں۔

فضا صـ ۱۵۲

لکھتے ہیں :-
فضا کو بالکسر غلط بتایا گیا ہے (قاموس) یہ قول بھی محل نظر ہے۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ فضا کے اصل معنی ہیں فراخی اور کھلا ہوا میدان۔ بہار، رونق اور کیفیت کے معنوں میں یہ ہند ہے۔ پھر جب ایک لفظ کے معنوں میں تصرف کیا جا سکتا ہے تو اس کی حرکات میں تصرف کیوں نہیں ہو سکتا؟ مؤلفین قاموس کو معلوم نہیں کہ فضا بکسر اول کو اُردو میں جائز ہی نہیں مرجح بتایا گیا ہے۔ صاحبِ نور نے بفتح اول لکھ کر مزید لکھا ہے کہ " اُردو میں زبانوں پر بکسر اول ہے "۔ جلیل مانک پوری کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو۔ " فضا بالفتح، مگر اُردو میں بول چال میں بالکسر مستعمل ہے۔ اگر کوئی صاحب صحت کے خیال سے بالفتح کہیں تو مضائقہ نہیں۔ (مکتوب جلیل۔ ماہ نامہ الحمرا لاہور نومبر ۱۹۵۶ء)

ہاں آصفیہ میں اس کو صرف بفتح اول لکھا گیا ہے۔ اس لفظ میں
حرف اول کی دونوں حرکات قابل تسلیم ہیں۔

واصف عرض کرتا ہے :۔ فارسی میں ایک مصدر ہے فزائیدن بفتح اول۔ اس کا فعل امر فزا ہے جو کسی اسم کے ساتھ ترکیب پا کر اسم فاعل سماعی بن جاتا ہے۔ مثلاً جانفزا۔ اردو میں اس کا فتحہ اول کسرہ سے تبدیل ہو چکا ہے اور عام طور پر بکسر فا بولتے ہیں اور یہی فصیح ہے۔

عربی میں فضاء بروزن کمال بفتح اول ہے۔ اس کے معنی ہیں المکان الواسع الفارغ الخالی۔ یعنی وہ جگہ یا زمین جو وسیع افتادہ اور خالی ہو۔ اس میں کوئی عمارت اور درخت نہ ہوں۔ اردو میں منظر اور کیفیت ہوا کے معنی میں بولتے ہیں۔ رونق اور بہار جو معنی لکھے ہیں وہ غلط ہیں۔ فضا اچھی بھی ہوتی ہے اور خراب بھی۔

ض اور ز کا تلفظ اردو میں یکساں ہے۔ اس لئے دونوں میں زبر زیر کا فرق اچھا اور مفید ہے۔ تاکہ سننے والا امتیاز کر سکے۔ اور شاید اسی مصلحت سے اردو کے داناؤں نے فارسی لفظ میں تصرف کیا ہوگا۔ نادانوں نے دونوں کو یکساں سمجھا۔ بہر حال فضا بفتح اول ہی صحیح اور فصیح ہے۔

دن بدن ، گھر بہ گھر ص ۱۵۳

اور اسی قبیل کا ایک مرکب برسہا برس ہے۔ یہ سب قابل ترک اور غیر فصیح ہیں ان کے مقابل روز بروز اور ہر ایک گھر اور سالہا سال موجود ہیں۔ اور اردو میں برسا برس کے معنی ہیں۔ برس کے برس ، سالانہ ، ہر سال۔ عوام نے سالہا سال کا ترجمہ برسہا برس کیا ہے جو نہایت بھونڈا اور واجب الترک ہے۔ اپنی سالہا سال کی محنت و عرق ریزی کو عوام کی بد ذوقی پر قربان نہ کیجیے۔

یگانگت ، یکسانیت ص ۱۵۴

فاضل مصنف لکھتے ہیں :۔

> مولفین قاموس نے یگانگت کو غلط بتایا ہے اور یکسانیت کو بھی اسی کے ساتھ نادرست قرار دیا ہے۔ آرزو لکھنوی نے بھی یگانگت کو ترک کرنے کی فرمائش کی ہے۔ " یگانگی کی جگہ یگانگت بولنا

صحیح نہیں ہے۔" (نظام اردو ص۴۶)
مؤلف آصفیہ نے بھی یہی لکھا ہے۔" یہ لفظ غلط ہے یگانگی صحیح ہے یہی رائے مولانا نظم طباطبائی کی تھی۔ (معائب سخن ص۴۵)
زبان میں قواعد کی پابندیاں ٹوٹتی رہتی ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں بہت سے نئے لفظ بھی بن جاتے ہیں۔ اور نئے لفظوں کے اضافے سے زبان کا دامن بھی وسیع ہوتا ہے۔ اردو میں تو بہت سے لفظ اسی طرح بنے ہیں۔ اگر قاعدوں کی پابندی ہی کی جاتی رہتی تو یہ ذخیرہ عالم وجود میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ جب کوئی لفظ بن جائے اور رواج پا جائے تو اُسے قبول کر لینا چاہیے۔ قواعد کی خاطر ارتقائے زبان پر پابندیاں نہیں لگائی جا سکتیں۔ بل کہ زبان کی خاطر قواعد کو لچک دار بننا پڑیگا۔ مؤلف آصفیہ نے یگانگت کے بجائے صحیح لفظ یگانگی بولنے کی فرمائش کی ہے۔ فرمائش کرنے کی حد تک تو یہ قول اچھا معلوم ہو سکتا ہے۔ جب اس پر عمل کیا جائے گا تب اندازہ ہوگا کہ یہ مشورہ کس قدر غلط ہے۔ مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی کی اس عبارت میں یگانگت کے بجائے یگانگی کا پیوند لگا کر دیکھیے خود اندازہ ہو جائیگا۔
"انگریزی کے سہارے یگانگت کا خیال پرائے مال پر دولتمند بننے کی آرزو ہے۔" (نقوش سلیمانی ص۹۹) ذیل کے جملوں میں یہی بات پائیے گا۔
"کہتے ہیں کہ سلطان مصر نے بادشاہ روم سے طرح یگانگت کی ڈالی۔" (میر امن گنج خوبی ص۴۵) "سو مسلمانوں میں یگانگت دین مذہب کی کفایت کرتی ہے۔" (گنج خوبی) مصحفی کے اس شعر کو بھی دیکھیے:۔
اعتماد یگانگت بھی تھا + اتحاد موانست بھی تھا (مثنوی بحر المحبت)
مصحفی نے تو اس کو بترکیب فارسی نظم کیا ہے۔ اب کیا فرماتے ہیں فصحائے کرام؟

واصف عرض کرتا ہے :۔ الفاظ بنتے بھی ہیں رائج بھی ہوتے ہیں اور متروک بھی ہوتے ہیں اور عرصے تک فصیح رہنے کے بعد غیر فصیح بھی ہو جاتے ہیں۔ دیکھیے۔ بیاج ہلنا بالفتح ، آوے ہے ، جاوے ہے ، کبھو ، کسو ۔ تمام متقدمین کے کلام میں ہیں اور فصیح تھے ۔ اب متروک اور غیر فصیح ۔ استاد داغ کے زمانے کے بھی بہت سے الفاظ و محاورات متروک ہو چکے ہیں اور بعض متروک ہو کر پھر زندہ اور فصیح ہو گئے ۔ جیسے رُندھنا ، کجلانا ۔ سنولانا وغیرہ ۔

یگانگت اور یکسانیت کے الفاظ کسی بڑے سے بڑے استاد نے استعمال کیے ہوں ۔ ظاہر ہے کہ یگانگی اور یکسانی کے مقابلے میں ثقیل ہیں ۔ تعجب ہے کہ بیگانگی پر ہاتھ صاف نہیں کیا ۔ اس کو بیگانگت نہیں بنایا ۔ سند میں جو مثالیں آپ نے پیش کی ہیں وہ موجودہ صورت میں غیر فصیح ہیں ۔ یگانگت کے بجائے یگانگی رکھنے سے فصیح ہو جائیں گی ۔ قواعد کی خاطر ارتقائے زبان پر پابندیاں بھی نہیں لگائی جا سکتیں اور قواعد قیاس کو کسی اختراعی لفظ یا ترکیب کی فصاحت کا فیصلہ کرنے کے لیے حَکَم بھی نہیں بنایا جا سکتا ۔ لیکن ارتقائے زبان ہے کیا چیز ؟ اگر ہر قسم کی تبدیلی یا اختراع وجدت کا نام ارتقائے زبان ہے تو بے شمار گھناؤنے الفاظ اور مکروہ محاورے بزم فصاحت کے مسند نشین ہو جائیں گے اور ذوق سلیم کسی گوشے میں بیٹھ کر آنسو بہاتا رہے گا ۔ اُردوئے معلیٰ کی فریاد کون سنے گا ؂

من از بیگانگاں ہرگز ننالم   کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

ایک روز میں ایک دکاندار سے کچھ سودا خرید رہا تھا ۔ ایک شخص جو کچھ دیر پہلے اپنی فہرست دے گیا تھا ، آیا اور پوچھا کہو بھئی میرا سامان باندھ دیا ؟ دکاندار نے اس کا پرچہ نکالا اور کہا تمھارا سب سامان تیار ہے سنبھال لو ۔ اس نے کہا ٹوٹل مارو ۔ کتنے کا ہوا ؟ میں نے دکاندار سے کہا ۔ میاں ! ٹوٹل مارو کہاں کی زبان ہے ؟ وہ گاہک میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا ، یہ ہماری کباڑیوں کی زبان ہے ۔

اُردو میں چھپٹا مارنا ، لات مارنا ، ٹھوکر مارنا ، ہاتھ مارنا وغیرہ محاورے ہیں اور صحیح ہیں ۔ لیکن اس قیاس پر بہت سے غلط اور بھونڈے محاورے ایجاد ہو گئے جو قابل ترک ہیں ۔ مثلاً ڈینگ مارنا ، گپ مارنا ، دھاوا مارنا ، بریک مارنا ، نعرہ مارنا ۔ ان کی

صحیح صورت یہ ہے ۔ ڈینگ ہانکنا، گپ ہانکنا یا گپیں لڑانا ، دھاوا کرنا ، بریک باندھنا یا بریک لگانا ، نعرہ لگانا۔ دلّی ہی کے ہوٹلوں میں یہ آواز بھی سنائی دیتی ہے "دو چاول دو ، اُتروا مار کے" یہ ذائقہ نواز محاورہ بھی لغت میں آنا چاہیے ۔

تقسیم ہند کے نتیجہ میں جب پناہ گزینوں کا سیلاب آیا تو پناہ گزین کا لفظ بفتح گاف مشہور ہوا۔ راقم الحروف نے جب کبھی سُنا فوراً ٹوکا اور غلطی سے آگاہ کیا۔

افسوس! شہر کے وہ بڑے اور با اثر لوگ نہیں رہے جو اپنی زبان اور لٹریچر کا جنون کی حد تک خیال رکھتے تھے ۔ اب وہ باتیں سر بسر خواب پریشان ہوگئیں ۔

مولوی عنایت اللہ خاں دہلوی اپنے فرزند سے مدتوں اس بات پر ناراض رہے کہ ان کی زبان سے معافی چاہتا ہوں کے بجائے معافی مانگتا ہوں نکل گیا تھا ۔

کچھ عرصے کی بات ہے راقم الحروف کٹرہ نیل میں سے گذر رہا تھا ۔ ایک ہندو نوجوان دوسرے ہندو نوجوان سے کہہ رہا تھا "معافی چاہتا ہوں ، رات کو میں حاضر نہیں ہو سکا ۔" میں نے اپنے رفیق سے کہا ۔ دلی کی زبان ابھی کچھ پرانے وضعدار خاندانوں میں باقی ہے ۔

آپ نے جن حضرات کو فصحائے کرام کے خطاب سے نوازا ہے وہ فرماتے ہیں کہ "جس طرح گرمایش فصیح تھا اسی طرح گرمائیت بھی فصیح ۔ اور بھی بہت سے الفاظ فصیح ہونے جا رہے ہیں ۔ ٹھنڈایش ٹھنڈائیت وغیرہ اسی قیاس پر بناتے چلے جاؤ۔" کورس کی ایک کتاب ہے "معاشیات کے ابتدائی اصول" شائع کردہ نیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۔ اس کے صفحہ ۲۴۳ پر دلچسپیت کا لفظ کتنا دلچسپ ہے ۔ یہ حاصل مصدر بنانے کا دوسرا کلیہ ہاتھ آیا۔ (خط کشیدہ فعل تو فصیح تر ہوگا۔؟)

سنسنی خیز صـ ۱۵۴

فرماتے ہیں : ۔

مؤلفین قاموس نے سنسنی خیز کو بھی غلط بنایا ہے اور دن بدن کو بھی غلط ٹھہرایا ہے ۔ اردو میں معلوم نہیں کتنے ایسے لفظ ہیں جن کا ایک جز فارسی یا عربی ہے اور ایک جز ہندی کا ہے ۔ جیسے پھلوار تھانے دار، لٹھ باز، چوکیدار وغیرہ کس کس کو نکالا جائیگا ۔ ذرا اس شعر

کو دیکھیے :-

اک سنسنی پوش سے آغوش رنگین کیجیے
جی میں ہے اس مصرع موزوں کو تضمین کیجیے

یا مثلاً یہ شعر :-

یہی جھینکنا کو بکو گھر بگھر ہے پسر کو ٹھکانا نہ بیٹی کو بر ہے

اور ایسی ہی بیشمار مثالیں ، مؤلفین قاموس ہوں یا کوئی اور بزرگ ،
اس طرح کے اقوال قابل التفات نہیں ۔

واصف عرض کرتا ہے کہ سنسنی خیز ، اتھل پتھل ، پوچھ تاچھ ، پارلیمنٹ کے ہو رہے اجلاس میں ، آج شام کو پانچ بجے جلسہ ہونے جا رہا ہے ، مہلوکین ، بھگدڑ ۔ وغیرہ اس قسم کے الفاظ و محاورات اخبارات کے تراشے ہوئے ہیں ۔ ان کو اخبارات کے صفحات تک محدود رہنا چاہیے ۔ ادب و شعر اور شائستہ محفلوں سے ان کو دور رکھنا بہتر ہے ۔

پھول دار ، تھانیدار ، چرخے والان ، چوڑی والان وغیرہ بیشک ایسے مرکبات ہیں جو رائج ہیں اور قابل قبول ہیں ۔ لیکن اگر یوں کہا جائے کہ گھر کا سودا میں نہیں لاتا ، عورتیں خود ہی پھیری والان سے خریدتی رہتی ہیں ۔ کیا آپ کے مذکورۂ بالا قیاس پر یہ نو ایجاد محاورہ صحیح ہوگا ؟ آپ نے دوسری جگہ تحریر کیا ہے :-

> مگر ایسے مرکبات کا دائرہ محدود رہے گا ۔ خاص خاص لفظوں کے علاوہ عام لفظوں کی یہ صورت نہیں ہوگی ۔ یعنی گوشتِ بھینس دودھِ بکری ، انجنِ ریل ، درد گھٹنا ، اونٹِ بے نکیل جیسے مرکبات قابل قبول نہیں ٹھہریں گے ۔ البتہ ظرافت یا تمسخر کی ضرورتوں کے کام آسکتے ہیں ۔ (زبان اور قواعد ص ۲۷)

غلط لفظ یا غلط ترکیب کو اُس وقت قبول کیا جا سکتا ہے جب اس کا بدل موجود نہ ہو ۔ سنسنی خیز کے متبادل لفظ اگرچہ موجود ہیں ، دہشت انگیز ، ہولناک تاہم یہ مرکب قابل درگذر ہے ۔ اتھل پتھل کا بدل ہلچل اور کھلبلی اور افراتفری وغیرہ ۔ پوچھ تاچھ کا متبادل پوچھ گچھ ۔ بھگدڑ اردو میں کوئی لفظ ہے ہی نہیں ۔ دراصل بھاگنا سے صیغۂ صفت بھگی اور بھگڑ اور بھاگڑ ہے ۔ جیسے جھکڑ ، بھلکڑ ، گھمڑ وغیرہ ۔ وہ لوگ جو نئے نئے

اہل زبان بنے تھے انھوں نے سمجھا کہ یہ بھاگ اور دوڑ کا مرکب ہے لہٰذا دال کا ہونا ضروری ہے ۔ انھوں نے ایک گاف کو دال سے بدل دیا۔ تھلوک، ابھی حال میں ایجاد ہو کر سامنے آیا ہے جو بالکل غلط ہے ۔ واضح ہو کہ ہلاک مصدر مجرد لازم ہے اور لازم کا اسم مفعول کا صیغہ نہیں ہوتا ۔ اسم فاعل ھالک ہے ۔ اس کے معنی ہلاک ہونے والا ۔ باب افعال میں جا کر متعدی بنتا ہے ۔ اِھلاک کے معنی ہلاک کرنا۔ اس کا اسم فاعل مُھلِک بروزن مخبر و مسک و مُقبل ہے ۔ اس کے معنی ہلاک کرنیوالا غرضکہ لفظ مہلوک بالکل غلط اور قابل رد ہے ۔

تعجب ہے کہ نیا لفظ ایجاد کرنے کے لئے عربی فارسی کا مونھ دیکھا جائے اور پھر یہ ضد بھی ہو کہ ہم نے جو لفظ ایجاد کر لیا ہے وہ اگر از روئے گرامر غلط ہے تو ہوا کرے مگر چونکہ ہم نے ارتقائے زبان کے اصول پر ایجاد کیا ہے اس لئے ہر ایک کو ماننا پڑے گا اور لغت میں بھی شامل کرنا پڑے گا ۔

اسفندیار، اصفہان ص ۱۹۶

فاضل مصنف کہتے ہیں کہ یہ دونوں لفظ اصل میں بکسر اول ہیں مگر زبانوں پر عام طور پر بفتح اول ہیں ۔ لہٰذا لغت میں ان کی دونوں حرکات درج ہونی چاہئیں ۔ اور فتحۂ اول مرجح ہے ۔

واضح ہو کہ اسفندیار اور اصفہان دونوں عَلَم ہیں ۔ یہ اُنہیں الفاظ میں سے ہیں جن کی ابتداء بحرف ساکن ہوتی ہے ۔ الف مکسور اسی وجہ سے بڑھایا گیا ہے ۔ (مزید تشریح لفظ برہنہ کے تحت لکھی ہے) ان لفظوں کو عام لوگ نہیں جانتے ۔ صرف ایک مخصوص تعلیم یافتہ طبقہ جو فارسی ادب سے مناسبت رکھتا ہے وہ جانتا ہے اور وہ لوگ بالکسر ہی بولتے ہیں ۔ اگر کسی مکتب کے استاد نے بالفتح پڑھا دیا تو قابل استناد نہیں ۔ اس قسم کی غلطیاں مکتبوں اور پرائمری اسکولوں سے شروع ہوتی ہیں اور راسخ ہو جاتی ہیں ۔

میں نے ایک مدرس صاحب کو گلستانِ سعدی پڑھاتے ہوئے دیکھا ۔ وہ شاگرد کو ہُماں اور مُرا بضمۂ اول پڑھا رہے تھے ۔ میں نے کہا کہ ہماں "ہم آں" کا مرکب اور مرا "من را" کا مرکب ہے ۔ بالضم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ۔ فرمایا ہم نے اپنے

استاد سے اسی طرح پڑھا ہے ۔ یہ نااہل مدرسین خود کوئی تحقیق نہیں کرتے بلکہ اگر کتاب میں غلط چھپ گیا ہے تو ویسا ہی پڑھا دیتے ہیں ۔

برہنہ ص ۱۹۸

لکھتے ہیں :- " بلحاظ اصل حرف اول مفتوح ہے - اردو میں اس طرح بھی استعمال کرتے ہیں - اور بکسر اول بھی بولتے ہیں - یہی صورت برہمن کی ہے کہ اصلاً حرف اول مفتوح ہے ۔ مگر گفتگو میں بکسر اول بھی آتا ہے - اس کو اردو کا تصرف قرار دیکر شامل لغت کرلینا چاہیے "

واصف عرض کرتا ہے کہ لفظ برہنہ کو اہل دہلی بفتح اول بولتے ہیں ۔ قدیم فارسی میں بفتح اول ہی ہے ۔ اور سلیمان حییم نے جدید تلفظ بَ رَہْ نِ ہْ بروزن کتابی لکھا ہے ۔ لفظ برہمن پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ سنسکرت کا لفظ ہے ۔ سنسکرت اور انگریزی میں ایسے بہت سے الفاظ ہیں جن کی ابتدا حرف ساکن سے ہوتی ہے ۔ جیسے اسکول ، اسٹیشن ، پرائیویٹ ، پرنٹنگ ، برہمن ، پریم ، پران ، پیار ، پریس ۔ وغیرہ ۔ عربوں نے کہا ابتدا بسکون محال ہے ۔ یہی حال فارسی اور اردو والوں کا ہے سنسکرت کا دور ختم ہوا ۔ آرین نسل کا لب ولہجہ ہندوستان کی آب و ہوا کے اثر سے بدل گیا اور ایسے الفاظ کا تلفظ دشوار ہو گیا ۔ دہلی اور یو ۔ پی والوں نے اسکول اور اسٹیشن کے سین کو ساکن رکھنے کے لئے الف بڑھایا اور باقی الفاظ میں حرف اول کو متحرک کر دیا ۔ اس میں مختلف لہجے ہیں ۔ کہیں زبر دیا گیا کہیں پیش اور کہیں زیر دیا گیا ۔ پنجاب والوں نے اسکول اور اسٹیشن کے سین کو متحرک کر دیا ۔

پریشان ص ۲۰۰

اس لفظ کو بہار عجم میں بکسر تین لکھا ہے وہ تو غلط ہے اس کے علاوہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ فارسی کے کونسے لغت میں بالکسر ہے ۔ یہ لفظ مرکب ہے - پری + سان - پریدن سے پری اور سان کے معنی مثل و مانند ۔ مطلب ہوا پری جیسا غائب و غیر حاضر اور متفرق و منتشر ۔ مراد حواس باختہ ۔ پھر ایران کے عربی دانوں نے سین کو شین سے بدل دیا ۔ شان عربی لفظ ہے بمعنی حال و کیفیت ۔ معنی وہی رہے ۔

پنجرہ ص ۲۰۱

جیم موقوف ہے اور موقوف تقطیع میں متحرک ہو جاتا ہے۔ یہ لفظ فارسی میں بفتح اول ہے۔ مگر اردو میں بکسر اول فصیح ہے۔ اہل دہلی کے لہجے میں نون غنہ ہے اور جیم ساکن ہے۔ یعنی بروزن فعلن۔

تلمیذ ص ۲۰۲

مصنف علام لکھتے ہیں :۔

صاحب نور اللغات نے لکھا ہے۔ "تلمیذ (ع) یہ لفظ عربی میں بالفتح فارسی میں بالکسر ہے"۔ یہ برعکس بات ہے۔ یہ لفظ عربی میں بکسر اول ہے۔ (المنجد) یہ صراحت بھی کردی گئی ہے کہ شاید یہ فارسی کے لفظ تلیذ بفتح اول کی تعریب ہے۔ "تلمیذ بالکسر، شاگرد۔ تلامذہ جمع، و ظاہر فارسی است و عربی فصیح نیست و لہذا صاحب قاموس نیاوردہ۔ اما تحقیق آنست کہ معرب تلمیذ است بالفتح (منتخب اللغات) مطلب یہ ہوا کہ فارسی میں بفتح اول ہے اور عربی میں بکسر اول۔ اُردو میں صرف بفتح اول مستعمل ہے۔ بکسر اول کو عربی سے متعلق سمجھنا چاہیے"۔

واصف عرض کرتا ہے کہ صاحب منتخب اللغات کو سہو ہوا ہے۔ تلمیذ عربی لفظ ہے معرب نہیں ہے۔ اور فصیح عربی ہے۔ اور صاحب قاموس نے لکھا ہے ہاں جس جگہ درج کرنا چاہیے تھا وہاں درج نہیں کیا۔ باب المیم فصل التا میں ضمناً آیا ہے۔ التلام کسحاب التلامیذ حذف ذالہ ولیس من ھذہ المادۃ انما ھو من باب الذال (قاموس) وقد اورد صاحب التاج علی صاحب القاموس انہ لم یذکر التلمیذ فی باب الذال اصلا وھو عجیب (واصف)

التلمیذ بالکسر الغلام تلمیذا کان او غیر تلمیذ۔ وھما استدرکہ صاحب اللسان فی ھذا الباب التلمیذ جمعہ التلامیذ وھم الخدام والاتباع۔ (تاج العروس) المراد منہ المتعلم او الخادم الخاص للمعلم (شرح شواہد المغنی بحوالہ تاج) التلامیذ الخدم والاتباع، واحدھم تلمیذ۔ (لسان العرب)

یہ لفظ شایستہ اور تعلیم یافتہ طبقے میں ہے اور بالکسر ہی بولا جاتا ہے۔

فارسی میں بھی بالکسر ہے۔ سلیمان حیسم نے اس کو عربی بتایا ہے اور بکسر اول لکھا ہے۔ اگر کوئی اس کو باب تفعیل کا مصدر تصور کر کے بالفتح بولے تو غلط ناقابل اعتبار اور لائق تنبیہ ہے۔ امداد علی بحر کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے (دیکھو زبان اردو قواعد صنف ۴۶)

جدہ ص ۲۰۲

لکھتے ہیں :۔ عربی میں بفتح اول و دال مشدد مفتوح کے معنی ہیں :۔
مادر، مادر رو مادر پدر (منتخب اللغات) اور معروف بندرگاہ کے معنی
میں بکسر اول اور بضم اول دونوں طرح ہے (غیاث اللغات) اردو میں
ان دونوں معانی میں یہ لفظ صرف بفتح اول و دال مشدد مفتوح
مستعمل ہے۔ اور اردو میں اسی طرح صحیح مانا جائیگا۔"

داصنف عرض کرتا ہے :۔ بندرگاہ عرب جدّہ بکسر اول صحیح ہے مستند نقشوں میں اور منتخب اللغات وغیرہ میں اسی طرح ہے۔ منتخب میں بالضم کے کچھ اور معنی لکھے ہیں۔ البتہ معجم البلدان میں بالضم بھی لکھا ہے۔ ممکن ہے چھٹی صدی ہجری میں اس کا یہ تلفظ بھی رہا ہو۔ اور آج کل عربوں سے بکسر اول سننے میں آتا ہے۔ بہر حال یہ عَلَم ہے اور جس طرح اب وہاں کے باشندے بولتے اور لکھتے ہیں اسی طرح صحیح و فصیح ہے۔ وہاں کی ڈاک کی مُہر میں اس کا انگریزی املا J.E. (جے ای) کے ساتھ ہے۔ اور وہ لوگ اپنے خطوط میں آئی سے بھی لکھتے ہیں۔ دیکھا آپ نے؟ ایک لفظ کے صحیح اعراب کو معلوم کرنے کے لئے ہمیں اس کا انگریزی اسپیلنگ تلاش کرنا پڑا۔ یعنی یہاں بھی مونھ دوسروں کا دیکھنا پڑا محض تائید حاصل کرنے کے لئے۔ اور علم حاصل کرنے کے لئے تو دوسروں کا نہ صرف مونھ تکنا پڑتا ہے بلکہ جوتیاں بھی سیدھی کرنی پڑتی ہیں۔ جس نے اس میں شرم کی یا چھوت چھات کی وہ محروم رہا۔ اطلبوا العلم ولو کان فی الصین (الحدیث)
یہاں شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے۔ اعراب بالحروف کی افادیت اور اہمیت کا۔

اردو میں اعراب بالحروف کا رواج پہلے بھی بہت کم تھا مگر تھا ضرور۔ داغ کے زمانے تک مندرجۂ ذیل املا تھا :۔
اُس کا اوس۔ اُٹھانا کا اوٹھانا۔ اُنیس کا اونیس۔ اُبھرنا کا اوبھرنا۔ اُبلنا کا

ادبلنا۔ اُدھر کا اودھر۔ اُجڑنا کا اوجڑنا۔ وغیرہ۔ انگریزوں کے عہد میں اُردو کی خدمت کے لئے کلکتہ کے بعد لاہور کو مرکزیت حاصل ہوئی۔ اس زمانے میں اصلاحات کے نام سے کچھ تبدیلیاں ہوئیں جن میں سے بعض میں افادیت کا پہلو غالب تھا۔ مثلاً یائے مجہول و معروف اور ہائے ملفوظ و مخلوط کا فرق۔ اور بعض تبدیلیاں ایسی کی گئیں جن میں کچھ فائدہ نہ تھا محض ایک منطقی اپج تھی۔

مندرجہ بالا مثالوں میں واؤ زائدہ نہیں تھا۔ اصلی تھا اور جزو لفظ تھا تلفظ میں ذرا دب گیا تھا۔ لیکن ضمہ ماقبل کی دلیل اور نشانی تھا۔ جن دماغوں پر منطقی تصورات چھائے ہوئے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ جب تلفظ میں نہیں رہا تو کتابت میں بھی نہیں رہنا چاہیے۔ اس تبدیلی سے کچھ فائدہ تو ہوا نہیں۔ مزید دشواری پیدا ہوگئی۔ ایک تو یہ کہ اُس اور اِس کا امتیاز ختم ہوگیا، دونوں پر اعراب لگانا ضروری ہوگیا۔ اور اعراب لگانے میں قدرتی طور پر ہر ایک انسان بے پروا ہوتا ہے۔ زیر اور پیش عام طور پر نہیں لگایا جاتا۔ پڑھنے والے غلط پڑھ جاتے ہیں اور غلطی محسوس کرکے دوہرانا پڑتا ہے۔ اور غلطی محسوس کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس تبدیلی میں کوئی سہولت بھی نہ تھی۔ ایک جگہ واؤ کی کتابت سے بچے تو دو جگہ زیر اور پیش لکھنے کی پابندی لگ گئی۔ واؤ کو تو ہر شخص پابندی سے لکھتا تھا کیونکہ وہ جزو لفظ تھا۔ مگر اعراب لکھنے کی پابندی نہ ہوسکی۔ تیسرے یہ کہ لفظ میں سے ایک اصلی جزو کم ہوگیا۔

اس قسم کی منطقی تبدیلیاں بعض محاورات میں بھی کی گئیں۔ مثلاً بھیڑیا چال کو بھیڑ چال کردیا۔ وجہ یہ کہ مشبہ بہ تو بھیڑ کی چال ہے۔ بھیڑیے سے یہاں کیا تعلق؟ (اس کی تحقیق دیکھو اردو مصدر نامہ ردیف بھ، ڑ)

جرح، جسارت، جحم، حلقوم، خانقاہ صـ ۲۰۵

جرح اور جسارت کو بالکسر کوئی نہیں بولتا۔ غلط اور زخمی چیز کو صحیح کیوں مان لیا جائے؟ جحم بفتح اول و سکون ثانی صحیح ہے اور اسی طرح بولا جاتا ہے۔ بفتحتین قابل تسلیم نہیں۔ حلقوم بضم اول ہی صحیح اور فصیح ہے۔ اگر کوئی بالفتح بولے تو اس کو آگاہ کیجیے۔ خانقاہ میں نون موقوف ہے مفتوح نہیں۔ خان گاہ کا معرب ہے اور بیگمات دہلی تو اکثر اصل لفظ خان گاہ ہی بولتی ہیں۔ صاحب نور اللغات نے با نون مفتوح غیاث اللغات

سے نقل کر دیا ہوگا۔ غیاث نے اس کو خانہ گاہ کا مرکب و معرب لکھا ہے۔ اور دلیل یہ دی ہے کہ جس طرح منزل گاہ اور مجلس گاہ کی ترتیب ہے اسی طرح یہ بھی ہے۔ یہ دلیل صحیح نہیں ہے۔ خاں کے معنی ہیں معزز و محترم، آقا، بزرگ وغیرہ۔ خانقاہ کے معنی ہیں۔ دینی پیشواؤں کے رہنے کی جگہ یا نشست گاہ۔

خدمات ص۲۰۶

فاضل مصنف لکھتے ہیں :- بلحاظ لغت بکسر اول و فتح دوم (خِدَمات) ہے۔ مگر اردو میں صرف بکسر اول و سکون دوم مستعمل ہے اور اسی طرح فصیح ہے۔ نور میں اس کو عربی کے مطابق بکسر اول و فتح دوم لکھا گیا ہے اردو کے تصرف کا ذکر نہیں ملتا۔ آصفیہ میں اس کے برعکس خِدْمات ملتا ہے اور اس کو عربی لکھا گیا ہے۔ یہ انتساب صحیح نہیں۔ یہ تو مہند صورت ہے۔ یہ لکھنا ضروری تھا کہ اصلاً خِدَمات ہے اور اردو میں خِدْمات مستعمل ہے اور یہ مہند صورت ہے۔

راقم عرض کرتا ہے کہ۔ خدمت بکسر اول بروزن فطرت اور بفتح اول بروزن حضرت دونوں طرح آتا ہے۔ مؤخر الذکر کی جمع خدمات بفتحتین آتی ہے۔ اور اول الذکر کی جمع بکسر اول و فتح ثانی بھی اور بکسر اول و سکون ثانی بھی، دونوں طریقے پر آتی ہے۔ اور آجکل جدید عربی اور جدید فارسی میں یہ تینوں جمعیں استعمال ہو رہی ہیں۔

ان میں سے کوئی جمع قدیم عربی میں نہیں تھی۔ نہ تو کسی کتاب میں نظر سے گذری۔ نہ تاج، لسان اور صحاح میں ہے حتی کہ اقرب میں بھی نہیں ہے۔ عصر حاضر کے دفتری نظام میں اس کی ضرورت پڑی تو اب پچاس ساٹھ برس سے استعمال ہو رہی ہے۔ غرضکہ تینوں جمعیں اور دونوں مفرد، عربی لفظ ہیں اور گرامر کے مطابق ہیں۔

مہند یا مورد ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

خدیجہ ص۲۰۶

فرماتے ہیں :- اصل کے لحاظ سے یہ بفتح اول و کسر دوم بروزن نتیجہ ہے آصفیہ میں یہ موجود نہیں۔ نور میں ہے اور اصل کے مطابق۔ اردو میں یہ لفظ بطور نام مستعمل ہے اور عام طور پر بضم اول و فتح دوم مستعمل ہے۔

اس لفظ کی دونوں صورتیں قابل قبول ہیں۔

واقف عرض کرتا ہے کہ فاضل مصنف کے نزدیک تو سب کچھ قابل قبول ہے۔ تیسری صورت خطیجہ اور چوتھی صورت ختیجہ نہیں لکھی۔ چاروں صورتیں نظر سے گذر چکی اور کانوں میں پڑ چکی ہیں۔

ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، صاحب وحی صلی اللہ علیہ وسلم کی مونس وہمراز و غمگسار، سب سے پہلی مسلمہ کا اسم گرامی بروزن عقیدہ ہے۔ جو لوگ اپنی لڑکیوں کا یہ نام رکھتے ہیں وہ کوئی نیا نہیں ہوتا۔ تبرکاً و تیمناً ام المؤمنین کے نام پہ نام رکھتے ہیں۔ جیسے پیغمبروں کے نام پہ نام رکھے جاتے ہیں۔ جو کوئی غلط بولے اسکو صحیح بتانا چاہیے۔ نہ یہ کہ اُس اُس میرے کان میں گھس۔ جو سُن لیا جیسا سُن لیا اور جس سے سُن لیا اس پر فصاحت کا ٹھپا لگا دیا۔ یہ عجیب کام آپ نے اپنے ذمہ لیا ہے۔

بعض ناواقف لوگ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مرضعہ ثُوَیْبَہ (بروزن زبیدہ) کو ثوبیہ (بروزن فوزیہ) لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ یعنی اعراب بھی بدل دیتے ہیں اور ی ب میں تقدیم و تاخیر بھی کر دیتے ہیں۔ یہ تو ناواقف لوگوں کی حرکتیں ہیں لیکن واقف حضرات کا فریضہ کیا ہے؟

دجلہ صـ۲۰۸

تمام عربی اور انگریزی نقشوں میں اور معجم البلدان میں بھی بالکسر ہے اور یہی رائج ہے۔ اور ہم نے اپنے اساتذہ سے گلستان بوستان وغیرہ میں بالکسر ہی پڑھا ہے۔

خلوت، زراعت، زمام صـ۲۱۱

فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ خلوت اصلاً بفتح اول ہے۔ نور میں اسی رعایت سے لکھا گیا ہے کہ بالفتح صحیح، بالکسر غلط۔ مگر یہ فیصلہ غیر مناسب ہے۔ اردو میں بکسر اول بھی استعمال ہوتا ہے۔ زراعت، لغت میں بفتح اول۔ زبانوں پر بکسر اول ہے۔ دونوں حرکات قابل اندراج ہیں۔ زمام اصلاً بکسر اول ہے۔ نور میں بھی اصل کی رعایت سے اس کو بکسر اول لکھا گیا ہے۔ مگر اردو میں زبانوں پر عموماً بفتح اول ہے اور اردو میں یہی صورت مرجح ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔

گذارش ہے کہ خلوت بفتح اول ہی صحیح و فصیح ہے۔ اور شائستہ طبقے میں اسی طرح
بولا جاتا ہے۔ زراعت عربی میں بھی بکسر اول ہے۔ اردو میں بھی بکسر اول بولا جاتا ہے۔ زمام
بے شک اصل میں بکسر اول ہے۔ اردو میں بضم اول مشہور ہے اور غلط العوام کے تحت
آتا ہے۔ بفتح اول کہیں نہیں سنا۔ بعض علماء سے بالکسر بھی سننے میں آتا ہے۔
خلوت کو بعض ناواقف لوگ بالکسر خلعت کے دھوکے میں بولتے ہیں۔ خاصت بکسر
اول صحیح ہے۔

سپردن ص ۲۱۱

فاضل مصنف لکھتے ہیں :۔ کہ فارسی مصدر سپردن کی حرکات میں اچھا خاصا
اختلاف ہے۔ بضمتین بھی ہے۔ بکسر اول و فتح ثانی بھی ہے۔ بضم اول و
فتح ثانی بھی لکھا گیا ہے (وغیرہ) تفصیل کے لئے دیکھیے غیاث اللغات
آگے لکھتے ہیں، مختصر یہ کہ اس لفظ کو بضم اول و دوم اور بکسر اول وضم
دوم دونوں طرح درست ماننا چاہیے۔

عرض ہے کہ یہ اصل فارسی میں بکسر اول وضم دوم ہے اور مشترک ہے۔ راہ طے کرنا۔
اور سونپنا وغیرہ۔ دوسرا مصدر سپاردن ہے اس سے سپارش مشتق ہے۔ سپری بکسر اول
و فتح دوم کے معنی ختم شدہ، طے شدہ۔ سپر بکسر اول و فتح دوم ڈھال۔
میرا خیال ہے کہ چونکہ یہ دو معنوں میں مشترک تھا۔ ہندوستانی فارسی دانوں نے
دونوں میں فرق کرنے کے لئے راہ طے کرنے کے معنی میں بکسر اول و فتح دوم کو متعین کر دیا۔
مناسبت سپار، سپری، سپر کے ساتھ ظاہر ہے۔ بلکہ حلیم تو اس کا ماخذ سپر لکھتا ہے اور
وہ بفتح دوم ہی ہے۔
اور سونپنا کے لئے تھوڑا سا تصرف کر لیا یعنی سپردن بضمتین۔ پس ہندوستان
میں معنی اول کے لئے بکسر اول و فتح دوم صحیح ہے۔ راہ سپر کا قافیہ نظر خبر کے ساتھ صحیح
ہوگا۔ اور سونپنا کے معنی میں بضمتین صحیح ہے۔ سپردن کا قافیہ خوردن مردن کے ساتھ
صحیح ہوگا۔

صومعہ، طہارت، ظرافت، عندلیب ص ۲۱۶

فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ صومعہ اصلاً بفتح اول وسوم ہے۔ اردو میں بانول

بفتح اول وکسر سوم بھی ہے۔ دونوں طرح صحیح ماننا چاہیے۔ طہارت
اصلاً بفتح اول زبانوں پر بکسر اول بھی ہے اور یہ صورت بھی قابل تسلیم
ہے۔ یہی صورت ظرافت اور عندلیب کی ہے۔ اصلاً بفتح اول مگر زبانوں پہ
بکسر اول۔ لہذا دونوں قابل تسلیم۔

گزارش ہے کہ صومعہ بکسر سوم اور طہارت ظرافت عندلیب۔ یہ الفاظ بکسر اول
کہیں نہیں بولے جاتے۔ غلط تلفظ تجویز کرکے دوسروں سے تسلیم کرانے کی کوشش کرنا
بڑی عجیب قسم کی خدمت ہے اردو ادب کی۔

عجلت، عروس، عروض ص ۲۱۶

فرماتے ہیں:۔ عجلت عربی میں بکسر اول ہے۔ اردو والے بضم اول استعمال
کرتے ہیں۔ عروس اور عروض اصلاً بفتح اول ہیں مگر اکثر زبانوں پر بضم
اول ہیں۔ یہ دونوں صورتیں قابل تسلیم ہیں۔

واصف عرض کرتا ہے کہ۔ عجلت جلدی کرنے کے معنی میں اصل میں بفتحتین ہے۔
(بالکسر نہیں) اردو میں بضم اول وسکون ثانی بولتے ہیں اور یہی فصیح ہے عروس اور
عروض بفتح اول صحیح اور فصیح ہیں۔ بضم اول غلط اور سزاوار تنبیہ۔

غلاف عنایت ص ۲۱۶

عنایت، توجہ و مہربانی کے معنی میں عربی میں بھی بالکسر ہے بالفتح نہیں۔ غلاف، اردو
میں بھی بالکسر ہی بولا جاتا ہے اور اگر کوئی بالفتح بولے تو اصلاح کی جائے۔

غدر ص ۲۱۶

اردو میں فتنہ و فساد کے معنی میں بھی بولتے ہیں۔ اس صورت میں بفتحتین کو
غلط العام میں داخل کیا جائے تو ٹھیک ہے۔ لیکن عہد شکنی کے معنی میں۔ بفتح اول و
سکون دوم ہی صحیح اور فصیح ہے۔

فوارہ ص ۲۱۷

لکھتے ہیں:۔ آصفیہ ونو۔ دونوں میں ف پر زبر ہے۔ مگر زبانوں پر بضم
اول ہے۔ دونوں صورتیں قابل قبول ہیں۔

واصف عرض کرتا ہے کہ یہ عربی لفظ ہے۔ مادہ اس کا ف و ر۔ اس مادہ کے الفاظ

اردو میں فوراً فی الفور بھی مستعمل ہیں۔ فوارہ بروزن علامہ اسم مبالغہ ہے۔ اس کے معنی ہیں پانی کا وہ منبع جس سے پانی اچھلتا اور اُبلتا ہو۔ جو حضرات اس کو بالضم بولنا چاہتے ہیں ان سے درخواست ہے کہ وہ اس کے بجائے اردو کا لفظ پھوارا یا پھوہارا بولا کریں۔ (لفظ پھوہارا کی تحقیق آگے آئے گی)

قبول قزلباش ص۲۱۷

قبول، عربی میں بالفتح اور بالضم دونوں طرح آتا ہے۔ اردو میں کچھ لوگ بالفتح اور کچھ بالضم بولتے ہیں۔ دہلی میں زیادہ تر بالفتح بولا جاتا ہے۔ قزلباش کو ہم تو بچپن سے بکسرتین ہی بولتے اور سنتے چلے آئے ہیں۔ اور یہی صحیح ہے۔ بفتح اول و کسر ثانی ہم نے نہیں سُنا۔

قطامہ، قطعہ، لامحالہ

قطامہ کو اردو میں بالضم کوئی نہیں بولتا۔ قطعہ بالکسر ہی بولا جاتا ہے۔ قطعۂ زمین، ایک قطعہ چیک بالفتح کوئی نہیں بولتا۔ لامحالہ صرف تعلیم یافتہ لوگوں میں رائج ہے۔ بالضمۂ میم کوئی نہیں بولتا۔

گرفت ص۲۱۸

گرفت، گرفتاری، گرفتار۔ ہم تو ہر عالم و جاہل خواندہ و ناخواندہ سے بکسرتین سنتے ہیں۔ بفتح اول و کسر ثانی؟ یہ نیا تلفظ نہ صرف اجنبی بلکہ موجب وحشت ہے معلوم نہیں آپ کہاں سے نکال لائے۔

لغایت

فرماتے ہیں :۔ اصلاً لغایتہٖ تھا بکسر اول۔ اردو میں لغایت بن گیا۔ بفتح اول۔

داؔصف عرض کرتا ہے کہ تیسرا تلفظ بضم اول جو زیادہ بولا جاتا ہے۔ وہ آپ نے نہیں لکھا، بھول گئے۔ اور یہ کس نے بہکا دیا کہ لغایتہٖ تھا۔ بہر حال اس کا صرف ایک ہی تلفظ قابل قبول ہے۔ بروزن عنایت۔ جاہل منشیوں اور عرائض نویسوں سے ادب کو متاثر نہ ہونے دیجئے۔

مراعات، مہارت

مراعات صرف بضم اول صحیح و فصیح ہے۔ یہ باب مفاعلہ کا مصدر بروزن مساوات و موافات ہے۔ بالفتح غلط اور ناقابل تسلیم۔ مہارت کو بالضم کوئی نہیں بولتا۔ اگر کوئی اناڑی بالضم بولے تو ماہرین لسان کو اپنا کریڈٹ لینا چاہیے۔

نحوست، ندامت، نزاکت ص۲۲۰

نحوست اردو میں بھی زیادہ تر بفتحتین ہی بولا جاتا ہے۔ بالفتح جاہل عورتیں بولتی ہیں ان کو تنبیہ کی جائے۔ ندامت، نزاکت عام طور پر بالفتح رائج ہیں۔ بالکسر جاہلوں کی زبانوں پر ہو سکتا ہے وہ ناقابل تسلیم ہے۔

نفاذ، نشان، نشاط ص۲۲۱

نشان، فارسی میں بھی بالکسر ہے۔ بالفتح کہیں نہیں۔ اس کا ماخذ نشاندن ہے وہ بھی بالکسر ہے (یا یہ نشاندن کی اصل ہے) صاحب غیاث نے سہواً اس کو بالفتح لکھ دیا ہے اُسی سے نور میں نقل کر لیا گیا۔ نشاط ادبی حلقوں کا لفظ ہے بالفتح بولنے کی ہدایت کیجیے۔ نفاذ جس طبقے کا لفظ ہے وہاں بالفتح ہی بولا جاتا ہے۔ بالکسر غیر فصیح اور ناقابل تسلیم۔

نشہ ص۱۳ و ۹۳، نشو و نما ص۲۲۱

فاضل مصنف نے ص۱۳ پر مولانا حالی کا ایک اقتباس دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اردو میں نشا بروزن وفا بولا جاتا ہے اور اسی طرح فصیح ہے۔ اگرچہ دراصل یہ نشأۃ بروزن وحدت ہے۔ ص۲۲۱ پر نشو و نما کے تحت فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ اصلاً نون ثانی پر زبر ہے۔ (نشو و نما) نور میں صراحت بھی کی گئی ہے کہ نما بضم اول غلطی سے بول چال میں ہے۔ حالانکہ سبھی نشو نما بضم نون ثانی کہتے ہیں۔ اردو میں بضم نون ثانی ہی مرجح ہے۔

واصف عرض کرتا ہے:- عربی میں ایک مادہ ن ش ء (مہموز اللام) ہے۔ مجرد میں اس کے مصادر یہ ہیں:- نشأ (بروزن نظم) نُشُوء (بروزن اصول) نَشَاء (بروزن جمال)، نشأۃ (بروزن وحدت) نَشَاءَۃ (بروزن علامت) اس کے معنی زندگی

پانا، پیدا ہونا، نیا ہونا، پلنا بڑھنا۔ ان میں سے اردو میں تین وزن استعمال ہوتے ہیں۔ پہلا انشاءٔ بروزن نظم۔ نشوونما میں یہی لفظ ہے۔ ہمزہ کے لئے واؤ لکھ کر ہمزہ لگانے لگے۔ جیسے مؤذن اور مؤرخ میں لکھتے ہیں۔ پھر تلفظ بھی واو کا ہوگیا۔ صحیح تلفظ یہ ہے (نَ شْ ءُ نُ مُ وْ) یا اس کا دوسرا وزن نشوء بروزن اصول ترکیب میں لایا گیا ہوگا۔ کثرت استعمال اور اصل سے ناواقفیت کی وجہ سے ہمزہ غائب ہوگیا۔ اور تلفظ بھی بدل گیا۔ چوتھا اور پانچواں وزن اور کتابوں میں استعمال ہوتا ہے۔ نشأۃ ثانیہ اور نشاءۃ ثانیہ۔ مجرد کا صرف ایک مشتق "منشا" اُردو میں استعمال ہوتا ہے۔ منشا کے معنی زندگی پانے، ظہور پذیر ہونے، تجدید پانے، جوان ہونے اور بڑھنے کی جگہ۔ مولد و منشا کی ترکیب میں یہی لفظ ہے۔ معنی مجازی، مقصد و خواہش اور داعیہ۔

باب افعال میں جاکر متعدی بنتا ہے۔ اِنشاءٌ۔ یہ مصدر اور اس کا اسم فاعل منشی (بمعنی محرر) اُردو میں مستعمل ہیں۔ غرضکہ فارسی لفظ نشہ سے اس مادہ کو کوئی نسبت نہیں۔ اس موقع پر منیر لکھنوی اور مولانا حالی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

ایک دوسرا مادہ ن ش و (ناقص واوی) ہے۔ اس کا ایک مصدر نشو بروزن نظم ہے۔ دوسرا نشوۃ بحرکات ثلاثہ بروزن وحدت و فطرت و قدرت۔ اس کے معنی شراب سے مست ہونا، نشہ میں ہونا۔ باب افتعال میں جاکر انتشاءٌ اور باب تفعل میں جاکر تنشی، بروزن تسلی و تجلی بنا۔ معنی وہی رہے۔

صحاح جوہری، تاج العروس، لسان العرب، اقرب الموارد، المنجد، کسی میں اسکا متعدی نہیں ملتا۔ اُردو میں منشّی اور منشیات کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ منشی بروزن منقوی باب تفعیل تنشیہ بروزن تجربہ کا اسم فاعل ہے۔ لیکن جدید عربی میں اس کے معنی کلف دینے کے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مؤلف مصباح اللغات نے لازم کے معنی میں انتشیٰ و تنشّیٰ کے ساتھ نشّیٰ کو کہاں سے لکھ دیا۔ بہر حال میرا خیال یہ ہے کہ منشی بروزن منقوی عربی میں مُسکِر یعنی نشہ آور کے معنی میں نہیں ہے۔ لفظ نشہ سے اہل ہند نے بنا لیا اور فصیح قرار پایا۔

لفظ نشہ کے بارے میں میرا خیال ہے کہ فارسی نہیں ہے۔ بلکہ مفرس ہے۔ نَشْوَۃ میں تصرف کیا ہے۔ یعنی واؤ کو ہمزہ سے بدلکر نشأہ (نَ شْ ءَ ہْ) بنایا اور متاخرین اور خاصکر

فارسی گویانِ ہند نے ہمزہ کو شین سے بدل کر شین کو شین میں مدغم کر دیا۔ نشّہ (نَ شْ شَ ہ) ہو گیا۔ اردو والوں نے مزید تصرف کر کے شین مشدد کو مخفف کر دیا۔ ساقیا نشہ نیست منظورم + رفع رنج خماری باید۔ نشناختی بکجا روی زکجا بایں سفر آمدی + تو خراب نشۂ کیستی کہ زخویش بے خبر آمدی (خواجہ میر درد) واضح ہو کہ اردو میں بروزن پشہ اور بروزن وفا دونوں درست ہیں۔ مگر املا بہائے مختفی ہوگا۔ نشّہ نہ کہ نشا۔

بہار عجم میں سند کے طور پر جتنے شعر دیئے ہیں سب میں اس لفظ کا املا غلط لکھا ہے مذکورہ دو صورتوں کے علاوہ اس کا کوئی تیسرا املا ہو ہی نہیں سکتا۔ بیدل کے کلام میں بھی ایک جگہ یہ غلط املا موجود ہے۔ اور دوسری جگہ صورت ثانی کے مطابق ہے۔

محبت در عدم بے نشاء پسند د غبارم را
ہماں گرد سرے میگردم و پیمانہ می سازم (دیوان بیدل)

چہ رسد ز نشۂ معنوی بدماغ ہیچش بے خبر
زپری پیالے اگر کشی بدکان شیشہ گران مبر (نکات بیدل)

میرزا مظہر کے کلام میں بھی یہ غلط املا موجود ہے۔

نشاء معنی ست در صورت پرستیہائے من — از حقیقت بادہ در جام مجازم کردہ اند

جب واؤ کو ہمزہ سے تبدیل کیا گیا اور آگے ہائے مختفی ہے تو ہمزہ کی نشست کے لئے ایک شوشہ (ی) کا لازمی ہونا چاہیے۔ جیسے دائم، سائل، مسئول اور مسئلہ میں ہے۔ صحیح املا وہی ہے جو ہم نے صورت اول میں بتایا ہے۔ یعنی نون کے بعد چار دندانے ہیں۔ تین دندانے شین کے اور ایک ہمزہ کے لئے۔ اس کے بعد ہائے مختفی۔ اور اسی کے مطابق دیوان صائب میں ہے :۔

نشئۂ رطل گراں از سنگ می یابیم ما — ہست در آزادئ اطفال گل بزبان ما
تنگنائے شہر جائے نشئۂ سرشار نیست — نشئۂ دیگر دہد در دامن صحرا شراب

(کلیات صائب تبریزی مطبوعۂ انتشارات کتاب فروشی خیام تہران)

نمو ص ۲۲۲

لکھتے ہیں :۔ نمو اصلاً بضم اول، زبانوں پر بفتح اول ہے۔ یہی صورت نمود کی ہے۔ کہ یہ بھی بفتح اول مستعمل ہے۔"

واضح ہو کہ عربی میں یہ لفظ دو طرح آتا ہے۔ ناقص واوی "ن م و" اس کا مصدر نُمُوّ بضمتین و واؤ مشدد بمعنی بالیدن۔ دوسرا مادہ ناقص یائی "ن م ی" اس کے مصدر چند اوزان پر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک نَمَاء بروزن جمال بھی ہے مرکب میں صحیح تلفظ دو طرح ہے نَشْوُونُمُوْ ۔ نَشْوُنَمَا۔ یہ مرکب اردو میں جس طرح بولا جاتا ہے فصیح ہے۔ لیکن تنہا نمو بضمتین و تشدید واؤ صحیح ہے۔ بالفتح غلط اور غیر فصیح۔

نمود، فارسی لفظ ہے۔ جبکہ نمائش، نمایندہ، نمایندگی، نمایاں، قطب نما، جہاں نما، بضمۂ نون بولے جاتے ہیں تو نام و نمود میں نمود کو بالضم بولنا کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے۔ قابل اصلاح ہے۔ البتہ نمونہ بالفتح ہی فصیح ہے۔

نوشتن ص ۲۲۲

فاضل مصنف لکھتے ہیں :- "فارسی میں نوشتن کی حرکات میں اختلاف ہے۔ نور میں نوشت کے ذیل میں لکھا گیا ہے کہ بفتح اول ودوم، نیز بفتح اول وکسر دوم۔ اس سے یہ قیاس درست ہوتا ہے کہ اردو میں یہ لفظ ان دو مختلف حرکات کے ساتھ مستعمل ہے۔ فارسی میں جو بھی صورت ہو، اردو میں نوشت، نوشتہ، نوشتن سب صرف بفتح اول وکسر دوم مستعمل ہیں۔ اور اردو میں اسی طرح صحیح مانے جائیں گے۔ آصفیہ میں نِوِشتہ ہے اور ٹھیک ہے اسی طرح نوِشت کو بھی ایک ہی طرح لکھا گیا ہے۔"

واصف عرض کرتا ہے کہ۔ فارسی میں نوشتن او نبشتن بکسرتین کے معنی ہیں لکھنا۔ اور نوشتن نوردیدن بفتحتین کے معنی ہیں لپیٹنا اور طے کرنا۔ اردو میں اول الذکر کے اندر تصرف ہوا۔ لیکن مؤخر الذکر کی اصل حرکات بحالہ قائم ہیں۔ جیسے راہ نورد کی ترکیب میں۔ اول کا اسم فاعل نویسندہ۔ دوم کا نوردندہ۔

نہنگ ص ۲۲۳

لکھتے ہیں :- نہنگ (گھڑیال) فارسی میں حرف اول مفتوح ہے۔ اردو والے عموماً بہ کسر اول بولتے ہیں۔

واضح ہو کہ :۔ گھڑیال (یا مگرمچھ) کے معنی میں یہ لفظ فارسی ہے اور بفتحتین ہے اور جو لوگ اس کے معنی سے واقف ہیں وہ اسی طرح (بفتحتین) بولتے ہیں۔ ننگا، بے حیا کے معنی میں یہ لفظ بکسر اول و فتح دوم ہے۔ اور اردو ہے۔ دونوں لفظ الگ الگ ہیں۔ اپنی اصل پر قائم و رائج ہیں۔ اور فصیح ہیں۔ (فرہنگ آصفیہ میں اعراب غلط ہیں)

ورع، وقار ص۲۲۴

وقار بالفتح صحیح اور فصیح ہے۔ سلیمان حیلیم نے بھی بالفتح ہی لکھا ہے۔ ورع کے بارے میں فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ یہ اصلاً بفتح اول و سکون دوم بھی ہے۔ اُردو میں اکثر سننے میں بفتحتین بھی آتا ہے۔ گذارش ہے کہ جب دونوں طرح صحیح ہے تو یہاں ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟

یثرب ص۲۲۴

لکھتے ہیں :۔ اصلاً بفتح اول و بکسر سوم ہے۔ نور و آصفیہ میں اسی طرح ملتا ہے۔ مگر زبانوں پر بفتح اول و سوم ہے۔ اور یہ بھی قابل قبول بل کہ مرجح صورت ہے۔

گزارش ہے کہ بفتح اول و کسر سوم بر وزن مجلس صحیح ہے۔ مدینہ منورہ کا پرانا نام ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہجرۃ کے موقع پر اس کا نام مدینۃ النبی ہوا۔ پھر مدینہ منورہ مشہور ہوا۔ قرون اولیٰ میں پرانا نام بالکل ترک کر دیا گیا تھا۔ ایرانی اور ہندوستانی شعرا نے اس کو باقی رکھا ہے۔ عوام جس طرح چاہیں ان کو بولنے دیجیے۔ لیکن عَلَم ہونے کی حیثیت سے اصل ہی پر رائج ہے۔ غلط تلفظ فصیح نہیں ہو سکتا قرآن میں بھی اس کا اعراب اصل کے مطابق آیا ہے۔

یورش ص۲۲۴

لکھتے ہیں :۔ اصلاً بضم اول و سوم ہے اور واؤ غیر ملفوظ ہے۔ اردو میں یہ دو طرح مستعمل ہے۔

(۱) بضم اول و کسر سوم و واؤ غیر ملفوظ بروزن خورش۔ نور میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۲) بضم اول و کسر سوم مع واؤ ملفوظ معروف۔ گفتگو میں عموماً اسی

طرح آتا ہے۔ لغت میں ان تفصیلات کے ساتھ ان سب صورتوں کا ذکر کیا جائے گا۔

گزارش ہے کہ سلیمان حیم نے اس کا تلفظ بروزن مونس لکھا ہے اور اردو میں اسی طرح رائج ہے۔ اس تلفظ کے علاوہ دوسرے غیر مانوس تلفظ اردو لغت میں لانے کی کیا ضرورت ہے؟

ترکیب مہند ص ۲۴۱

فاضل مصنف نے ترکیب مہند کے عنوان سے ایک باب باندھا ہے۔ جس میں اُن مرکبات سے بحث کی گئی ہے جو ایک خاص رجحان کی پیداوار ہیں۔ یعنی ہندی الفاظ کو فارسی رنگ میں رنگ دینا۔ ترکیب دینے میں فارسی گریمر کو استعمال کرنا۔ اور پھر فارسی گریمر سے تجاوز کر کے من گھڑت طریقے استعمال کرنا۔ مثلاً خرچ بھٹیارہا کی ترکیب میں بھٹیارا کی جمع بھٹیاران یا بھٹیارگان کے بجائے بھٹیارہا فارسی گریمر کے لحاظ سے بھی غلط ہے۔

فاضل مصنف نے ذخیرۃ الخوانین وغیرہ چند قدیم کتابوں سے ایک طویل فہرست اُن مرکبات کی دی ہے جن کے اجزاء ہندی یا ہندی و فارسی ہیں۔ مگر یہ کتابیں تو فارسی زبان میں ہیں۔ یعنی فارسی والوں نے ہندی الفاظ کو لے کر تصرف کیا ہے یا استعمال کیا ہے۔ وہ اردو زبان کے اُدبا و فصحا کے لئے کیونکر قابل سند ہو سکتا ہے؟

یہ زبان دفتروں کی پٹواریوں کی عرضی نویسوں کی عدالتوں کی تھی اور وہیں تک محدود رہی۔ ہمارے اُردو ادب میں فصحا و ماہرین لسانیات نے اس زبان کو داخل نہیں ہونے دیا اور ہمارے ادب کا قابل قدر سرمایہ نہیں بننے دیا۔ ایک عرضی نویس اگر مالائے مروارید یا ایام برسات لکھتا ہے تو ایک ادیب موتیوں کی مالا اور برسات کے دن لکھتا ہے افسوس کہ اب وہ لوگ نہیں رہے۔ ع

جن کا ہر فرمودہ علم و فن کی دستاویز تھا اور بقول میر درد

عنقا کی طرح جتنے تھے یاں نامور فلک — تونے خدا ہی جانے کہ کیوں دھرا اڑا دیئے
عالم میں جتنے پاک گہر تھے سو ایک ایک — اولے سے روزگار نے یوں ہی گھلا دیئے

غرضکہ کھچڑی بے نمک، خرچ بھٹیارہا، دربار اکھاڑا، شدت باد و جھکڑ،

چلم تمباکو، چھاؤنی زندان، متصلِ سڑک، چیخ وپکار، جھگڑا و ٹنٹا، موسم برسات، موجِ لہو، بے چینیٔ دل، راج و مزدور، وغیرہ جیسی ترکیبیں فصیح نہیں قرار دی جاسکتیں یہ فارسی زدہ ذہنیت کی مصنوعات زبان کے ارتقا کا ذریعہ نہیں بن سکتیں۔

دنیا کی ہر زبان میں طبقاتی امتیاز ہوتا ہے۔ اگر یہ باب قائم کرنے سے یہ مقصد ہے کہ دفتری، تجارتی، کرخنداری، بازاری وغیرہ سب زبانوں کو گڈمڈ کر دیا جائے اور ایک عجیب وغریب چوں چوں کا مربا بنا لیا جائے اور کسی کو چون وچرا کا حق بھی نہ رہے تو زبان کے ارتقا کا یہ منطقی تصور کسی طرح درخورِ تسلیم نہیں ہے۔

باب کے آخر میں فاضل مصنف نے مندرجۂ ذیل رائے کا اظہار کیا ہے۔ ہم اس کی تائید کرتے ہیں :۔

"غیر عربی فارسی الفاظ کے ٹکڑے اکثر واو عطف کے بغیر آتے ہیں اور فصاحتِ کلام کا عموماً تقاضا بھی یہی ہوا کرتا ہے۔ جیسے پھول پھل ڈاک تار، خط پتر، ہاتھ پیر، دانہ پانی، دن رات وغیرہ ایسے بیشمار ٹکڑے ملیں گے اور یہ اسی طرح آتے ہیں۔ اگر ان کے درمیان عطف کا واو لایا جائے یعنی پھول وپھل یا دن ورات یا ڈاک وتار کہا جائے یا لکھا جائے تو فصاحتِ کلام پر حرف آجائے گا۔

اب تک زبان کا جو انداز رہا ہے اُس میں یہ گنجائش تو ہے کہ ہندی یا انگریزی کے خاص خاص لفظوں کو اضافی ترکیبوں کے ایک جُز کے طور پر لایا جاسکے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض مرکبات ایسے ہی دو اجزا پر مشتمل ہوں جیسے ممبرانِ پارلیمنٹ، اجرائے ڈگری، کاغذاتِ اپیل، ارکانِ کمیٹی، بذریعۂ رجسٹری، انتظامِ جیل وغیرہ۔ مگر ایسے مرکبات کا دائرہ محدود رہے گا۔ خاص خاص لفظوں کے علاوہ عام لفظوں کی یہ صورت نہیں ہوگی یعنی گوشتِ بھینس، دودھِ بکری، انجنِ ریل، دردِ گھٹنا، اونٹِ بے نکیل جیسے مرکبات قابلِ قبول نہیں ٹھہریں گے۔ البتہ ظرافت یا تمسخر کی ضرورتوں کے کام آسکتے ہیں۔

آخری جملے سے مجھے اختلاف ہے۔ 'فوق البھڑک' جیسی ترکیبیں ظرافت کے طور پر معرض

وجود میں آئی تھیں اور آپ ان کو فصاحت کی سند دے چکے ہیں۔ اس قسم کی ظرافت کے وقت چاروں طرف نظر ڈال کر پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ محفل میں کوئی ایسا آدمی تو نہیں ہے جو اس کو صحیح و فصیح سمجھ کر لے اُڑے گا۔ یہ کرشمہ دل لگی ہی کا تو ہے کہ چلنا سے چنیدن بنا اور لغت میں درج ہو گیا۔

اعلان نون ص۲۸۸

نون غنہ کا بحیثیت حرف ہجا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ فارسی میں نون غنہ کا رواج پہلے ہو گا لیکن اب نہیں ہے۔ فارسی کلام میں جہاں کہیں حرف علت کے ساتھ ہمیں نون نظر آتا ہے ہم اس کو نون غنہ پڑھتے ہیں۔ لیکن نہ صرف ایرانی بلکہ افغانستانی اور ترکستانی بھی اپنے لہجے میں با اعلان نون پڑھتے ہیں۔ یعنی حرف علت کو دبانے ہیں کہ اس کا تلفظ زبر یا زیر یا پیش کے قریب ہو جاتا ہے۔ اور اعلان نون ہو جاتا ہے۔

پیران راہ دیدہ دریں راہ پُرخطر　　باقدِ چون کمان سبق از تیر بُردہ اند

خط کشیدہ الفاظ کو وہ اس طرح پڑھتے ہیں کہ کچھ حرف علت بھی ظاہر ہو۔ اور نون بھی صاف ظاہر ہو۔ چوں کہ اس طرح کا تلفظ ہندوستانیوں کے لئے دشوار ہے۔ انھوں نے نون غنہ کو ہی پسند کیا۔ بلکہ اتنا غلو کیا کہ نون اصلیہ اور نون زائدہ کا امتیاز بھی باقی نہ رہا مثلاً جان، دین، ایمان، مکان، احسان، امتحان، نادان، خون، عیان، تسکین، تحسین، جنون، ان سب الفاظ میں نون حروف اصلیہ میں سے ہے۔ خزان، طوفان، حیران، حیوان، انسان۔ گریان، نمایاں، افتان، خیزان، ان میں نون زائدہ ہے۔ مزید ستم یہ کہ اعلام پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ مثلاً یونان، چین، ایران، عثمان، رحمٰن، جیحون وغیرہ۔ اور نہ صرف شعر میں، بلکہ عام بول چال میں بھی رضی الدین خاں علاؤ الدین خاں بولنے لگے۔ رہا سہا بھی غائب ہو گیا۔ اس کارروائی سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اکثر الفاظ اپنے مادہ کے لحاظ سے ناقص ہو گئے۔ مثلاً دین کا "دی" رہ گیا۔ مکان کا "مکا" اور خون کا "خو" جان کا "جا" رہ گیا۔ حالانکہ ان میں نون حروف اصلیہ میں سے ہے۔ اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اردو زبان کے الفاظ کو صاف بچا گئے۔ چٹان، اوسان، مچان، ڈھلان، دھیان، گیان، پرچون، بین، تین وغیرہ۔

اب اعلان نون اور غنہ کے لیے کوئی کلیہ قاعدہ بنانا مشکل ہے۔ نون اصلی ذ

قاعدہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ذوقِ سلیم ہی اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

عاری ص ۳۲۱

فاضل مصنف نے امیر مینائی کا مندرجۂ ذیل اقتباس دیا ہے:—

آری۔ میرے نزدیک ہندی ہے۔ اس لئے کہ "عاری" زچ و تنگ و عاجز کے معنوں میں فارسی و عربی میں کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ ہندی میں تو عین سے لکھنا خلافِ اصول ہے۔ ہندی میں عین کہاں؟

اس پر اپنی رائے لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

عاری در اصل عربی کا لفظ ہے جس کے معنی برہنہ (منتخب اللغات) عربی میں یہ زچ و تنگ و عاجز کے معنی میں مستعمل نہیں۔ یہ لفظ بالعموم عین سے ہی لکھا جاتا ہے۔ اس لفظ میں معنوی تبدیلی کی بنا پر املائی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس کو الف سے لکھنا امیر کی ایجاد تھی۔ امیر کا یہ لکھنا کہ "آری میرے نزدیک ہندی ہے" محلِ نظر ہے۔ ہندی میں یہ لفظ زچ و تنگ و عاجز کے معنی میں نہیں ہے۔ ان معنی کے لحاظ سے "عاری" کو مہند کہا جائیگا۔ امیر کی یہ رائے اور امیر اللغات و نور اللغات کے اندراجات صحیح نہیں ہیں۔"

واقم عرض کرتا ہے کہ عاری خالص عربی لفظ ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ اگر اس کے معنی ہوں ننگا اور خالی جیسے عقل سے عاری، علم سے عاری۔ تو اس کا ماخذ ہو گا ع ر ی۔ اُردو میں اس مادہ کے مندرجہ ذیل مشتقات بولے جاتے ہیں۔ عاری، عریان، عریانی، معرّیٰ۔

اور اگر معنی ہوں زچ، عاجز، محجوب، تحیّر تمذر۔ جیسے ہم اس کی حرکتوں سے عاری آگئے۔ ہم تو کوشش کرتے کرتے عاری آ گئے۔ تو اس کا ماخذ ہو گا ع ی ر۔ اردو میں اس مادہ کے مندرجۂ ذیل مشتقات رائج ہیں عار، معیار، عیار بروزن حصار، عیار بروزن جبار، عار کے معنی وہ کام یا عیب یا کوئی چیز جو باعث ننگ ہو۔ اس میں یائے نسبتی لگا کر عاری بنایا، یعنی ننگ محسوس کرنے والا۔ اسی کے مجازی یا التزامی معنی زچ و عاجز کے ہیں۔ بغرضکہ عاری ہر لحاظ سے عربی ہے۔ مہند نہیں۔

بطور جملہ معترضہ ایک اور مادہ کا ذکر کرنا بھی مناسب ہے۔ ع و ر۔ اس کے بھی

کچھ مشتقات اُردو میں رائج ہیں۔ عورت، اعور، استعارہ، عاریت، مستعار، مستعیر
لفظ عاریت کے اشتقاق کے بارے میں جو قول صاحب فرہنگ آصفیہ نے نقل کیا ہے وہ
احقر کے نزدیک مرجوح ہے۔

واضح ہو کہ لفظ عاری جو ع ی ر سے مشتق ہے اور عادی جو ع د و سے مشتق
ہے اگر تنوین آئے تو ان کی یائے اخیر ساقط ہو جائیگی۔ جیسے عارٍ، عادٍ، قاضٍ، راضٍ
کافٍ، فاقضِ ما انت قاضٍ، کل من علیہا فانٍ۔

اور جو عاری، عارے، عادی، عادت سے یائے نسبتی لگا کر بنایا گیا ہے تنوین سے
اس کی یا ساقط نہیں ہوگی۔ جیسے عاریٌّ، عادیٌّ، حجازیٌّ، ھندیٌّ

مائُقرا صـ۳۳۳

اس کے معنی نور اللغات سے نقل کیے گئے ہیں کہ "ایسی تحریر جس کو آدمی
دقت سے پڑھ سکے۔"

یہ تشریح صحیح نہیں۔ مائُقرا کے لفظی معنی ہیں جو پڑھ لیا جائے اور اسی معنی میں استعمال
ہوتا ہے۔ ایسی تحریر جو بآسانی پڑھی جاسکے۔ یعنی لکھنے والا خوش خط نہیں ہے لیکن اس کی
تحریر پڑھ لی جاتی ہے۔ امیر اور عسکری کی عبارتوں کا یہی مفہوم ہے۔

اَنوٹ صـ۳۴۶

اس کے ماخذ کے متعلق فرہنگ آصفیہ میں جو لکھا ہے کہ "آن کی تصغیر ہے" مجھے اس
سے اختلاف ہے۔ وَٹ کا لفظ حاصل مصدر میں تو آتا ہے۔ جیسے سجاوٹ (وہ بھی الف
والے لفظوں میں) لیکن تصغیر کے لئے نظر سے نہیں گذرا۔ آن (فارسی) کے معنی ہیں ملکیت
این کتاب از آن من ست۔ اس معنی میں یہ لفظ پرانی دستاویزوں میں آتا ہے۔ اُردو میں
اس کے معنی عادت راسخہ جو موجب حمیت ہو باقی سب معنی مجازی ہیں۔

وَٹ، سنسکرت کا لفظ ہے۔ کروٹ، سلوٹ میں یہی لفظ ہے۔ اس کے معنی گھیرنا
باندھنا، ملانا، جوڑنا، آمادہ کرنا وغیرہ۔ اَن ہندی میں نفی کے لئے آتا ہے۔ جیسے اَن دیکھا،
اَن سُنی۔ تو اَنوٹ کے معنی ہوئے قابو میں نہ آنا، گھیرے میں نہ آنا، میل نہ کرنا، نہ ملنا، آمادہ
نہ ہونا، بچنا، کترانا، کسی پہلو قرار نہ ہونا۔ یہ بھی معشوقیت کی ادائیں ہیں۔ چھل بل کے معنی
بھی اس کے قریب قریب ہیں۔ شوخی چالاکی جھانسے بازی۔

شتر، شعور، شکیب، صندوق، عنوان ص۲۱۶

شتر بضمتین، شعور بضمتین، شکیب بکسرتین صحیح ہیں۔ آپ کے لکھے ہوئے تلفظ غلط اور ناقابل قبول، صندوق عربی میں بضم اول بھی ہے اور بفتح اول بھی، اور حلیم نے صرف بفتح اول لکھا ہے۔ اردو میں بفتح اول مستعمل ہے عنوان عربی میں بھی اور فارسی اور اردو میں بھی جبکہ بالضم مستعمل ہے اور صحیح ہے تو دوسرے نامانوس تلفظ کے ذکر کرنے اور پھر اس کا انکار کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟

بھدنا ص۳۵۴

امیر مینائی فرماتے ہیں :- بھدنا لفظ نہیں ہے۔ بدھنا ہے اور سرایت کرنے کے معنی میں مستعمل ہے" نور میں بھی اس کی تائید کی گئی ہے۔

اثر لکھنوی لکھتے ہیں کہ نور نے کوئی وجہ نہیں بیان کی کہ بھدنا کیوں غلط اور بدھنا کیوں صحیح ہے۔ لکھنؤ میں اس موقع پر بھدنا ہی کہتے ہیں بو کا بس جانا یا سرایت کر جانا۔ اور سوراخ کرنا بدھنا ہے۔ مثلاً بدھا موتی (فرہنگ اثر) فاضل مصنف کی رائے ہے کہ یہی صورت صحیح ہے کہ بدھنا یا بندھنا سوراخ ہونے کے معنی دیتا ہے اور سرایت کرنے کے معنی میں بھدنا ہے۔ آصفیہ میں نور سے زیادہ ابہام ہے اس میں نہ بدھنا ہے نہ بھدنا بلکہ ایک مصدر بندھنا ہے اور بھدنا اور بندھنا دونوں کے معانی اسی ایک مصدر کی طرف منسوب کیے ہیں۔

راقم عرض کرتا ہے کہ اس لفظ سے اہل دہلی واقف نہیں ہیں۔ کچے گوشت یا مچھلی میں جو مسالا لگا کر رکھا جاتا ہے اسے سوندنا (بفتح اول) کہتے ہیں۔ اور جب مسالا سرایت کر جاتا ہے تو رچنا کہتے ہیں۔ "مسالا رچ گیا اب چڑھا دو"۔ میرے خیال میں صاحب فرہنگ آصفیہ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ بندھنا بکسر اول بیندھنا کا مطاوع ہے اور بیندھنا کے معنی وہ خود لکھتے ہیں :- سوراخ کرنا۔ چھید کرنا، برمانا، برمے سے سوراخ کرنا، بیچوں بیچ سوراخ کرنا، موتی میں سوراخ کرنا، گودنا، کچوکے دینا، کچونا، کوچنا، طعنے دینے سے دل میں سوراخ کرنا۔

ان معانی میں پیوست کرنا، رگ رگ میں بٹھانا۔ کچھ نہیں ہے۔ پھر مطاوع (یا

فعل لازم) میں یہ معنی کہاں سے آگئے؟ یہ خیال رہے کہ سوندنا کی جگہ رچانا نہیں بولا جائیگا۔

ڈھونڈھے ہے ص۳۶۶

امیر مینائی کی رائے ــــ ڈھونڈھتا ہے کی جگہ "ڈھونڈھے ہے" اب زبان نہیں ہے۔ قدما کہتے ہیں۔ متاخرین نے ترک کر دیا ہے۔"

اس پر فاضل مصنف فیصلہ دیتے ہیں کہ ایسے افعال کو متروک قرار دینا زبان اور حسن بیان دونوں کی جان پر ستم کرنا ہے۔ شکر ہے کہ اُس زمانے میں بھی سب نے اس غیر مناسب فیصلے کو تسلیم نہیں کیا تھا اور آج تو اکثر لوگ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ پھر اپنی تائید میں فراق گورکھپوری کی کتاب "اردو کی عشقیہ شاعری" کا ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ جہاں آتا جاتا ہے کا الف دب جاتا ہے وہاں نہایت ناگوار صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ داغ کا مصرع ہے :۔

میں نے وہ رنج اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

قافیہ کس قدر مخلِ فصاحت اور بار سماعت ہے۔ اگر ذوق و مومن و غالب کی طرح داغ یہاں "جی جانے ہے" کہتے تو وہ خرابی پیدا نہ ہوتی۔ پھر ولی دکنی سے لیکر مولانا حسرت موہانی تک ۹ شعرا کی سند پیش کرنے کے بعد خانم ممتاز مرزا ایک خاتون شاعرہ کے دو شعر پیش کیے ہیں اور لکھتے ہیں کہ آجکل اساتذۂ متوسطین کی طرح ایسے افعال کو بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے :۔

کیا قیامت ہے کہ راہِ عشق میں ہر گام پر
منزلوں کا فاصلہ کچھ اور بڑھتا جائے ہے

اس شبِ تاریک میں تنہا ہوں میں تنہا ہوں میں
کوئی جگنو کوئی تارا، جی بہت گھبرائے ہے

(خانم ممتاز مرزا)

واصف عرض کرتا ہے :- واقعی داغ سے چوک ہو گئی۔ الف کے دبنے سے انھوں نے خیال نہیں کیا۔ ان کو یوں کہنا چاہیے تھا۔ "میں نے وہ رنج اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے"۔ نسیم دہلوی یوں کہتے تو وہ عیب دور ہو جاتا۔
رحم آجات ہے دشمن کی گرفتاری پر۔ بیخود بھی نہ رہے ورنہ ان کو بھی یہ مشورہ دیا جاتا۔

کوئی جاں جات ہے جب تیر نظر تیر کے ساتھ
خود تڑپ جات ہے صیاد بھی نخچیر کے ساتھ

سو برس پہلے کی زبان کو زندہ کرنے کی تکلیف کیوں اٹھائی۔ جو زبان آج بھی موجود ہے اور بولی جا رہی ہے اسی کو کھینچ کھانچ کر ادب میں شامل کر لیجیے۔
اور اگر آپ اس ترقیٔ معکوس کو ہی اچھا سمجھتے ہیں اور ایک صدی قبل ہی کی زبان کو زندہ کرنا چاہتے ہیں تو۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔ مگر شرط یہ ہے کہ نظم تک محدود نہ رہے۔ نثر میں اور مجلسی گفتگو میں اور عام بول چال میں بھی زندہ کیا جائے۔ پہلے آپ خود بولنا شروع کر دیجیے۔ اسی طرح رائج ہو جائیگی۔
نمونہ کے طور پر خانم ممتاز مرزا کے کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں :-

درد کی دولت بیدار کہاں ڈھونڈھو	یہ خزانے تو فقط دل کے خرابوں میں ملیں
عشق نے ظلم وہ ڈھایا ہے کہ جی جانے ہے	اس قدر ہم کو رُلایا ہے کہ جی جانے ہے
رہبر کا نہیں ذکر کہ بے وجہ چلے ہے	ورنہ مری منزل تو مرے ساتھ چلے ہے
ہم لاکھ بھلائے ہیں بھلائے نہ بنے ہے	اک نقش ہے جو دل سے مٹائے نہ بنے ہے

یہ کس کی خوشبو ڈھونڈے ہے یہ کس کا داماں مانگے ہے
دو چار گلوں کی بات نہیں دل سارا گلستاں مانگے ہے
نظروں میں بھرا استفسار سہی دل ایک تجھی کو جانے ہے
اپنی بھی نہیں اس کو پروا یوں کہنا تیرا مانے ہے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "اودھر، ایدھر، جیدھر، کسو، لوہو، ماٹی وغیرہ الفاظ نے کیا گناہ کیا ہے۔ اور بھی افعال وغیرہ ہیں۔ ان سب کو اپنی مسیحائی کے دامن میں پناہ دیجیے۔

ظالم میں کہہ رہا کہ تو اس خوں سے درگذر	سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

اردوئے معلیٰ کی نشأۃ ثانیہ آپ کے ہاتھوں ہو جائے تو اچھا ہے ۔

پیارا ، پیالہ ص۳۹۶

امیر مینائی فرماتے ہیں - پیار بروزن فاع ہے ۔ اس پر فاضل مصنف اپنی رائے لکھتے ہیں کہ اس قبیل کے کئی لفظ ہیں جن میں سے بعض کو باخفائے "یا" فصیح مانا گیا اور بعض کو باظہار "یا" ۔ ایسے لفظوں میں پیار، پیاس پیالہ، پیاز، پیال، پیادہ، دھیان قابل ذکر ہیں ۔ اسی وجہ سے ان کے تلفظ میں کبھی کبھی مختلف کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ میری رائے میں ایسے الفاظ کے کسی ایک تلفظ پر مہر نہیں لگانا چاہیے ۔

واصف عرض کرتا ہے کہ :- پیارا ، پیاسا ، پیال ، دھیان ، گیان ہندی الفاظ ہیں ۔ ان میں حرف اول حرف دوم کے ساتھ مخلوط ہے ۔ یعنی دونوں کا تلفظ ساتھ ساتھ ہوتا ہے ۔ پس پیارا بروزن فعلن ہی صحیح و فصیح ہے ۔

پیادہ ، پیالہ ، پیاز فارسی الفاظ ہیں ۔ فارسی میں ان کا تلفظ ہندی کی طرح نہیں ہے ۔ ابتدا کے دونوں حرف متحرک ہیں ۔ پس پیالہ بروزن فعولن ہی صحیح و فصیح ہے جن اساتذہ نے پیارا کو بروزن فعولن اور پیالہ کو بروزن فعلن باندھا ہے انھیں اشتباہ ہوا ۔ دونوں کو گڈمڈ کر دیا ۔ حتی کہ خیال ۔ میان ، نیام ، نیاز میں بھی بعض حضرات نے "ی" کو مخلوط قرار دیا ۔ بہرحال ذوق سلیم کا تقاضا ہے کہ امتیاز کیا جائے ۔

سنہ ص۴۰۸

امیر مینائی فرماتے ہیں : - سن بمعنی سال ، کہیں نہیں نکلتا ۔ فارسی میں تلاش کیا ۔ کوئی سند قابل اعتبار نہیں ملی ۔ ان معنی میں سنہ ہے ۔ اردو میں بغیر ترکیب اگر "سن" بمعنئ سال کوئی کہے تو تاویل ہو سکتی ہے محققین اس کی جگہ "سال" کہتے ہیں ۔

ا واضح ہو کہ لفظ سنہ کا مادہ س ن و ہے ۔ اس کا صحیح تلفظ سنۃ بروزن طلب ہے ۔ جمع سِنُون ، سَنَوات ، سَنہات ۔ اُردو میں صرف سِنین بولی جاتی ہے ۔ (حالت نصب و جر میں سنون کا واؤ یا سے بدل جاتا ہے) ۔

دوسرا مادہ ہے س ن ن ۔ اس سے مشتق ہے سِنّ بکسر اول و نون مشدّد ۔ اس

کے معنی دانت اور مقدارِ عمر وغیرہ۔ اس کی جمع اسنان بالفتح، باب افعال میں جا کر اسنان بالکسر کے معنی بوڑھا ہونا۔ اسی کا اسم فاعل مُسِن بروزن مُحِل اُردو میں بولا جاتا ہے۔ اس مادہ کے کچھ اور مشتقات بھی اُردو میں بولے جاتے ہیں۔ سنّت۔ مسنون۔ سِنان۔

اسلحہ ص۱۹۶

لکھتے ہیں:۔ عربی کے لحاظ سے لام پر زیر ہے۔ بول چال میں یہ لفظ بفتح لام اَسلَحَہ بھی آتا ہے۔ اس لفظ کی دونوں حرکات قابل تسلیم ہیں۔

اُفق ص۱۹۶

اصلاً بضمتین ہے۔ آصفیہ، نور و امیر اللغات میں بھی اس کو اصل کے مطابق بضمتین ہی لکھا گیا ہے۔ اردو میں اس کا ایک تلفظ اُفَق (بضم اول و فتح ثانی) بھی ہے۔ اس تلفظ کو بھی مان لینا چاہیے اور درج لغت کرنا چاہیے۔

اکسیر ص۱۹۷

بلحاظ لغت بکسر اول ہے۔ آصفیہ، نور، امیر اللغات سب میں اس کو بکسر اول لکھا گیا ہے۔ اردو میں زبانوں پر بفتح اول بھی ہے اور اسی طرح زیادہ سننے میں آتا ہے۔ اس کے بھی دونوں تلفظ درج لغت ہونا چاہیے۔

برادر ص۱۹۸

غیاث اللغات میں اس کو بفتح اول لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں ب پر زبر اور زیر دونوں حرکات لگائی گئی ہیں۔ بول چال میں یہ لفظ صرف بکسر اول ہے اور اُردو میں اس کو صرف بکسر اول ماننا چاہیے۔

بہادر ص۱۹۹

لغات میں اس کو بضم دال لکھا گیا ہے۔ اس کا ایک تلفظ بفتح دال بھی ہے۔ اس تلفظ کو بھی تسلیم کر لینا چاہیے۔ یہ اردو کا تصرف ہوگا۔ ۱

واصف عرض کرتا ہے — اسلحہ کو بفتح لام کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں بولتا۔ افق بضم فا اور بسکونِ فا دونوں طرح صحیح ہے۔ اردو میں بضمتین رائج ہے۔ بفتح فا کوئی

نہیں بولتا۔ اکسیر بالکسر ہی صحیح ہے اور زیادہ تر بالکسر ہی بولا جاتا ہے۔ برآدر کے متعلق تو صاحب غیاث اللغات کہتے ہیں کہ "بتصریح بنظر مؤلف نیامدہ کہ بفتح صحیح است یا بکسر" سلیمان حییم نے بالکسر لکھا ہے۔ اور اردو میں بھی بالکسر بولا جاتا ہے۔ لہٰذا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بہادر۔ دال کے زبر سے غلط اور ناقابل تسلیم بلکہ ناقابل ذکر۔

(۱)

عام قاعدہ اور دستور ہے کہ جب ضرورت پیش آتی ہے تو کسی چیز یا کسی معمول میں تبدیلی کی جاتی ہے۔ پوری کتاب میں لفظ بلکہ کا املا اس طرح ہے کہ بل کو الگ لکھا ہے اور کہ کو الگ۔ میں نے بہت غور کیا کہ قدیم املا کے خلاف یہ املا کیوں ایجاد کیا گیا۔ کیا وہ لکھنے میں کچھ مشکل تھا؟ یا پڑھنے میں دشوار تھا؟ ایسی کیا شدید ضرورت پیش آئی کہ نیا املا ایجاد کرنے پر مجبور ہو گئے؟ میں نہیں سمجھ سکا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ نیا املا پڑھنے میں بھی دشوار ہو گیا اور لکھنے میں بھی "بل" اور "کہ" مل کر ایک لفظ بن چکا تھا۔ اب "بل" کے لام کا دائرہ بنانا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے۔ پڑھنے میں "بل" کے اوپر زبان فوری طور پر خود بخود رک جاتی ہے۔ اس کے تلفظ میں وہ روانی نہ رہی جو پہلے تھی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ یہ دونوں حرف ہیں، اسم یا فعل نہیں۔ ان کو ملا کر لکھنے میں کیا قباحت تھی؟

بڑی حیرت اس پر ہے کہ آپ اقتباسات میں بھی اپنا ہی املا جاری کرتے ہیں۔ مثلاً ص ۳۳۹ تحت شگفانند "بل کہ فصیح ہے" ص ۳۶۳ "اب غزل کہ دنیا" ص ۳۶۵ "روپیا پیسا بہت چاہیے"

(۲)

"سب ٹھیک ہے"، جب آپ کا یہ اصول ہے تو آپ سے کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ ص ۲۵۸-۵۹ ملاحظہ ہو۔ "نہیں کھپ پاتے"۔ "دکھائی پڑتا ہے"۔ "نہیں مل پاتا" ص ۲۶۲ "نہیں بنا پائیں گے" وغیرہ
اس فصاحت سے کون انکار کرسکتا ہے؟ اردوئے معلیٰ کی ٹکسال کہاں ہے؟

اب اسے ڈھونڈھو چراغ رخ زیبا لیکر

یہ جو کچھ لکھا گیا اپنی معلومات اور رائے کے مطابق لکھا گیا۔ اور سہو و خطا سے منزہ صرف وہی ذات رب العالمین ہے۔

اردو املا

ایک تنقیدی جائزہ

قبل ازیں ایک تنقیدی مقالہ کتاب "زبان اور قواعد" پر ہدیۂ ناظرین کیا جا چکا ہے بعض احباب نے اصرار فرمایا کہ "اردو املا" کو بھی دیکھو۔ میں نے کثرت مشاغل اور اپنی کم علمی کا بہت کچھ عذر پیش کیا مگر مسموع نہوا۔ آخر یہ کسالا بھی برداشت کرنا پڑا۔ مطالعہ کیا اور مصنف علام کی وسعت مطالعہ، تحقیق و تلاش اور قابلیت کا دل سے اعتراف کیا۔ یہ کتاب بھی ترقی اردو بورڈ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے مصنف بھی مسٹر رشید حسن خاں ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ مصنف سلمہٗ بہت سی جگہ اصل موضوع سے ہٹ گئے ہیں۔ بجائے اصلاح کے ایجاد و اختراع کی جھلک نمایاں ہے۔

عام دستور ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو بنائی جاتی ہے یا ایجاد کی جاتی ہے۔ ایسا تو ہوتا ہے کہ ضرورت پوری کرنے کے لیے ایک ہی چیز سے کام لیتے رہتے ہیں اور ضرورت کے باوجود مدتوں نئی چیز ایجاد نہیں کرتے۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہوگا کہ بلا ضرورت کوئی چیز ایجاد کر لی جائے۔ یا کسی چیز یا مفہوم و مدلول کے وجود پذیر ہونے سے پہلے اس کا نام یا اصطلاح تجویز کر لی جائے۔

کم حوصلہ مدرسوں، کم ہمت کاتبوں اور بے پروا اخبارات نے جو اردو املا اور زبان و محاورات کی مٹی خراب کر رہی ہے، بجائے اس کے کہ ان کو آگاہ کیا جاتا ان کی اصلاح کی طرف قدم بڑھایا جاتا خود ہی سر تسلیم خم کر دیا۔ صحیح کو ہی غلط کرنا شروع کر دیا۔ اور متبادل مانوس اور فصیح کے موجود ہوتے ہوئے اجنبی نا مانوس اور بھونڈے الفاظ و محاورات اور طرق املا پیش کرنے شروع کر دیئے۔

مندرجۂ ذیل محاورات دلی کی سڑکوں پر آجکل سُنے جاتے ہیں :-
تمھاری کتاب اس نے میرے کو دیدی ہے ۔ میں نے تیرے کو کچھ نہیں کہا ۔ تمھارے کو معلوم ہونا چاہیے ۔ اعلانچی کہتا ہے ۔ آج شام کو پانچ بجے جلسہ ہونے جارہا ہے ۔ رُک جا! میں بھی آتا ہوں ۔ اس بلڈنگ کی مرمت جلدی ہونے جارہی ہے ۔ ہم بہت جلدی جلسے کی کارروائی شروع کرنے جارہے ہیں ۔

مُدعیانِ ترقی اردو فرمائیں کہ فصاحتِ زبان کی اس تباہی پر آپ کو آگاہی ہوئی ہے ؟ کیا کوئی صدائے احتجاج بلند کی گئی ہے ؟

کہا جاتا ہے کہ چونکہ اردو میں عربی فارسی کے غیر مانوس ، مغلق اور ثقیل الفاظ کی بھرمار ہے اس لئے برادرانِ وطن اردو سے بھڑکتے ہیں ۔ نیز اس کا رسم الخط مشکل ہے ۔ لہٰذا بحیثیت زبان کے بھی اس کو سلیس اور سہل بنایا جائے اور اس کے رسم الخط کو آسان بنانے کے لئے املا میں بھی اصلاح کی جائے ۔

جز اول کے بارے میں گزارش ہے کہ اردو کے معلّی کو آسان بنانے کی مہم میں خود آپ نے جو زبان استعمال کی ہے ایک ہی صفحے میں اس کا نمونہ یہ ہے :-

اُردو املا صلا ۔ معانی و مفاہیم میں کثرت کی جلوہ گری ۔ معانی کی تعداد سے کہیں زیادہ مفاہیم اس سے وابستہ ۔ کسی بھی مرحلے پر ۔ ٹھہراؤ والی کیفیت ۔ املائی تغیرات ۔ دو امور قابل لحاظ ہیں ۔ ابتدائی سطح پر ۔ عموماً اہم تغیرات ۔ زبان کے ابتدائی ادوار ۔ صورت پذیر ۔ سار تقائے زبان کا عمل ۔ ایک سطح پر اور ایک خاص انداز پر ۔ رائج اشکال ۔ مروج املا ۔ نئے معانی پرانے معانی کو بے دخل بھی کرتے رہتے ہیں ۔

ایک صفحہ اور لیجئے ــ صـ۱۳ بنیادی حیثیت ۔ کلیتاً ۔ معروف رسم الخط ۔ رومن اسکرپٹ ۔ خلط مبحث ۔ مرادف ۔ عمل ارتقا ۔ نافذ ۔ بروئے کار

اور ایک صفحہ ۔ صـ۴۲ ۔ تبلیغ ۔ مضامین تبصروں ۔ فیض کو عام کرتے رہے ۔ انتساب ۔ فیض بخشی ۔ اعتراف کی سعادت ۔ حاصل کرنا مقصود ہے ۔ دیدہ ریزی کو دخل ہے ۔ پرخلوص توجہ ۔ شامل نہوتی ۔ بے کراں اور بے اماں ۔ وجہ تسکین ۔ بزرگانہ شفقت نوازشوں اور مشوروں ۔ گراں بہا ، بیش قیمت اور بے بہا وغیرہ عام فہم الفاظ کو چھوڑ کر گراں ارز جیسے نامانوس الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ۔

سات سو صفحات کی کتاب میں سے یہ صرف تین صفحوں کے کچھ متفرق الفاظ بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں ۔ رہا املا کی اصلاح کا مسئلہ تو اس میں جو تغیرات تجویز کیے گئے ہیں اس سے تو اردو املا ایک منطقی گورکھ دھندا بن کر رہ گیا ہے مفصل بحث آگے آئیگی۔

تعجب یہ ہے کہ اردو ئے معلیٰ کا بھارتیہ کرن بھی کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ احمد بہمن یار کے حوالے دیگر ایرانی رجحانات سے اپنے من گھڑت قاعدوں کو مستند بنانے کی بھی کوشش کی جا رہی ہے ۔

لگے ہاتھوں ایک بات اور کہدوں ۔ آپ نے شہر دہلی کو بیکران و بے امان کے الفاظ سے یاد کیا ہے ۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کس بنیاد پر اس کو بے امان کہا ہے ۔ یہ شہر تو ہمیشہ اہل کمال کا مرجع اور ملجا و ماویٰ رہا ہے ۔ تمام عالم کے اہل کمال، علما ادبا شعرا ہنرمند اور صناع وغیرہ یہاں کھنچ کر آئے اور اس شہر کے حکمرانوں نے ان کو پناہ دی اور نوازا ۔ اور ان کے علم و فن کی قدر کی ۔ اور نہ صرف ارباب اقتدار نے بلکہ عوام نے بھی ان کو آنکھوں پر بٹھایا ۔ اگرچہ دارالسلطنت ہونے کی حیثیت سے اس کی یہی شان ہونی چاہیے تھی ۔ مگر عوام کے مزاج اور افتاد طبع کو بھی اس میں دخل ہے ۔ اور آج بھی وہ خو بو باقی ہے ۔ یہ بے امان نہیں دارالامان ہے ۔

تابش آموز ہے وہ گوہر غلطاں ابتک خاک آلودہ ہے پھر بھی ہے درخشاں ابتک

وہ لوگ تو جا سوئے جن کی طرف نگاہیں جاتی تھیں اور جن سے رجوع کر کے مشکل مسائل کو حل کیا جاتا تھا ۔ اور جن کا ایک لفظ بڑی بڑی کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتا تھا ۔ ہم جیسے کم علم و کم سواد ان کی جگہ آ گئے ۔ بڑوں کی موت نے اب ہم پر یہ فرض عائد کر دیا ہے کہ حتی الامکان ایسی بے راہ روی کی روک تھام کریں ۔ لیکن ہم صرف رائے پیش کر سکتے ہیں کوئی مانے یا نہ مانے ۔ ہمارے پاس نہ ویسی شخصیت ہے نہ اقتدار ۔ بہرحال اپنی فہم اور اپنے مبلغ علم کے مطابق اپنے خیالات پیش کرتا ہوں ۔

لکھاوٹ (اُردو املا ص۹)

سید انشا نے بھی ایسے کچھ الفاظ اختراع فرمائے تھے ۔۔ جماوٹ، گلاوٹ، اُلجھاہٹ، جمکاہٹ، شرماہٹ، الجھاوٹ وغیرہ ۔ اسی قماش کا لکھاوٹ بھی نیا ایجاد ہو کر سامنے آیا ہے ۔

لکھنا (مصدر) کے دو حاصل مصدر پہلے سے موجود ہیں۔ لکھائی اور لکھت ۔ جو مفہوم آپ چاہتے ہیں وہ بھی ان میں موجود ہے ۔یعنی انداز تحریر، طرز کتابت ، فصیح اور مانوس الفاظ کے ہوتے ہوئے اس ایجاد کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی ۔

پھر ایک تیسرا لفظ بہت ہی عمدہ اصطلاحاً رائج ہے ، املا ۔ جو آپ کے مرادی معنی کے لئے جامع و مانع ہے ۔اس کے ہوتے ہوئے لکھاوٹ کا لفظ کچھ خوبصورت نہیں معلوم ہوتا ۔

غفلت مجرمانہ یا بنیادی کوتاہی

فن خطاطی اور اس کے قواعد ماہر اساتذہ نے بڑے غور و فکر اور فہم و ادراک سے وضع کیے ہیں ۔ یہ صدیوں کے عملی تجربات ہیں ۔ انگلیوں کے ریاض کو منطقی موشگافیوں سے کوئی تعلق نہیں ۔ ایک باکمال مصور جو چہرے کی تصویر میں دلی جذبات تک کو کاغذ پر کھینچ لاتا ہے ۔ اگر اس نے قلم سے خوشنویسی کی مشق نہیں کی ہے تو موقلم سے وہ ایک دائرے اور ایک الف کی بھی صحیح تصویر نہیں کھینچ سکتا ۔

دنیا کی تمام زبانوں میں سے کسی زبان کا رسم الخط نستعلیق کی لطافت و نزاکت اور تناسب پیوندگی کا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ چھوٹے چھوٹے شوشوں سے بڑے بڑے حرفوں کا کام لیا جاتا ہے ۔شوشوں کی نوک پلک اور وضع و ہیئت پر حُسن خط کا مدار ہے ۔ اگر شوشے غلط ہو گئے تو سارا حسن خاک میں مل گیا ۔سب سے بڑی بنیادی غلطی یہ ہے کہ شوشوں کی تعداد اور تناسب و ترتیب کی طرف سے سخت بے اعتنائی برتی جاتی ہے ۔ اور اس کو املا کے مفہوم میں شامل نہیں سمجھا جاتا ۔حالانکہ شوشوں پر ہی نستعلیق کی اساس قائم ہے ۔ اور شوشے ہی املا کا جز و اعظم ہیں ۔

ایک کڑوی بات بھی کہہ دوں (اور سچی بات کڑوی ہی ہوتی ہے) اس بے اعتنائی اور غفلت کی ابتدا خود مصنفین سے ہی ہوتی ہے ۔ وہ اس اہم اور بنیادی فرض کا ذمہ دار کاتب کو سمجھتے ہیں اور کاتب اپنی کم علمی کی وجہ سے معذور ہے ۔ حالانکہ صحت املا خود مصنف کا اہم فریضہ ہے ۔

ہر ورق پر ہے میر کی اصلاح   لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے (سودا)

اپنا اپنا نقطۂ نظر ہے ۔ میرے نزدیک اس کی اتنی اہمیت ہے کہ پرچہ امتحان کے جواب

میں اگر طالب علم لفظ انتشار کو ایک بار یک شوشے کے اضافے سے (انتشار) لکھ دے تو اس کو جواب صحیح ہونے کی صورت میں پورے نمبر آپ تو دیدیں گے۔ کیونکہ خود آپ نے صفحہ ۱۶ پر اسی طرح لکھا ہے۔ انظر انداز کیا ہے۔ لیکن مں غلطی املا کے نمبر کاٹ دونگا۔

زیر نظر کتاب جو املا کی اصلاح کے لئے تصنیف کی گئی ہے۔ اس کے صفحات پر اس اہم ترین اور بنیادی جزو کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ ایک لفظ کا اگر ایک املا اختیار کر لیا تو وہی رہے۔ بلکہ ایک لفظ کی کئی کئی شکلیں کتاب میں بکھری پڑی ہیں۔

تغیر، بجیز، پھیر، اخیر، پیروی وغیرہ اس قسم کے الفاظ کو ایک با ریک شوشے کے اضافے کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ دیکھئے صفحات۔ ۱۴-۲۳-۱۱-۱۰۵-۲۴- ۸۷۔ یہ چند صفحات ہیں بطور نمونہ۔ تحفۃً، دفعۃً کی قسم کے الفاظ میں ہر جگہ ایک شوشہ بڑھایا گیا ہے۔ ایسی غلط نویسی ساری کتاب میں ہے۔

اور لیجیے — ایک ہی لفظ ایک ہی صفحہ پر تین طرح لکھا ہوا ہے۔ لفظ تمیز بروزن قدیر کو ایک شوشے کے اضافے سے تمیز لکھا ہے۔ پھر تمیئز بروزن تقدیر کو بھی اسی طرح لکھا ہے یعنی مزید شوشہ نہیں لکھا۔ سابق شوشے پر ہمزہ لگا دیا۔ پھر اسی تمیز بروزن تقدیر کو ایک نئے انداز سے تمییئز لکھا ہے۔ یعنی میم کے ساتھ پیالہ۔ اس کے بعد چھوٹا شوشہ، پھر (ر) سے پہلے موٹا شوشہ۔ مگر اس ابتری اور انتشار کا شاید آپ کو کوئی احساس نہیں ہوا۔

ہائے ہوز جہاں شروع میں آئی ہے اس کی گھنڈی غائب کر دی گئی ہے ہنڈی صفحہ ۱۳ ذہن صفحہ ۲۹ ۔ہٹ گئی صفحہ ۳۱ علیٰ ہذا القیاس بیشمار غلطیاں ہیں جن کا غلطیہائے املا کے سوا اور کوئی نام نہیں۔

اب ہم کیا سمجھیں ؟ ایک بڑے وقیع اور ذمہ دار ادارے کی طرف سے شائع ہونے والی ایسی اہم کتاب جس کا موضوع ہی اصلاح املا ہو اس کا کاتب املا یا خوش نویسی کی ابجد سے بھی واقف نہیں ؟ کیا یہی بات ہے ؟ یا یہ سمجھا جائے کہ ادارے کی طرف سے اس کو ایسی ہی ہدایات دی گئی ہیں کہ اس طرح لکھو۔ کیا بورڈ میں ایسی جزئیات کے متعلق کوئی تجویز پاس ہوئی ہے ؟

آپ کہتے ہیں کہ نستعلیق سے زیادہ حسین اور جامع صفاتِ حسنہ کسی زبان کا رسم الخط نہیں۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے۔ لیکن ہماری غفلتِ مجرمانہ کی بدولت جماعت ادنیٰ کے پنج سالہ بچوں سے لے کر پٹڑی نشین کاتبوں تک اس کی جو بُری گت بن رہی ہے اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں اس سے زیادہ برا کوئی رسم الخط نہیں۔ اور ڈیزائنروں نے آرٹ کے نام پر اس کو اور زیادہ خراب کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ شوشوں کا تناسب، تعداد اور پیمائش وغیرہ تو فن خطاطی سے وابستہ ہے۔ ماضی میں قط والے واسطین قلم سے لکھا جاتا تھا۔ اس سے چھوٹے بڑے شوشے بنتے تھے۔ معمولی خط وکتابت اور حساب کتاب کے لئے بھی واسطین قلم استعمال کیا جاتا تھا (اسکو کلک کہتے تھے) قلم کا قط ہی موٹائی اور فاصلہ وغیرہ ناپنے کا آلہ (پیمانہ) ہے۔ اب پنسل، بول پن، فونٹین پن سے وہ نوک پلک کہاں پیدا کی جا سکتی ہے۔

اپنے قصور کو کاتب غریب کے سر ڈالنے کا یہ سب سے بڑھیا عذر ہے۔ اس عذر کی بنا پر شوشوں کی معرفت کو املا سے خارج سمجھ لیا گیا۔ میں پھر کہونگا کہ شوشے ہی املا کی بنیاد ہیں۔ بنیاد پر کدال چلا دی تو عمارت کا گرنا لازمی ہے۔

اور یہ عذر کہ فونٹن پین سے شوشوں کی تعداد اور تناسب قائم نہیں رہ سکتا میں باادب عرض کرتا ہوں کہ یہ عذر لنگ ہے۔ کچھ عرصہ ہوا ایک مختصر سی کتاب بنام "سہ لسانی مصدر نامہ" شائع ہوئی تھی۔ شروع سے آخر تک پوری کتاب کی کتابت مصنف نے خود کی ہے۔ فونٹن پین سے قلم برداشتہ لکھی گئی ہے۔ اس کے مشاہدے کے بعد پھر کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں۔ آپ کو خود معلوم ہو جائیگا کہ اگر خط شکست کو ذرا سنبھال کر لکھا جائے تو شوشوں کا تناسب بخوبی قائم رہ سکتا ہے۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ ٹھیٹھ خط شکست خواہ کتنی ہی جلدی میں لکھا جائے اس میں اگر آپ چاہیں گے تو یہ تناسب بخوبی قائم رہ سکتا ہے اور اگر آپ نہ چاہیں اور اس کو غیر ضروری سمجھیں تو واسطین قلم سے بھی قائم نہیں رہ سکتا۔

الف مقصورہ بشکل ی صنف

عیسیٰ، موسیٰ، مصطفےٰ، مجتبیٰ، مرتضیٰ وغیرہ لکھتے ہوئے صدیاں گذر چکیں۔ قلم اس کا عادی ہو چکا۔ نظر مانوس ہو چکی۔ اب کہا جاتا ہے کہ ایسے الفاظ کو الف سے لکھا

جائے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اُس میں ایسی کیا دشواری تھی کہ اب یہ موجبِ وحشت اور غیر مانوس تبدیلی کی ضرورت پڑی۔ اور اب اس تبدیلی کے بعد کونسی آسانی پیدا ہو جائیگی۔

حکم تو یہ دینا چاہیے تھا کہ الف مقصورہ جو بشکل یٰ لکھا جاتا ہے اس پر کھڑا زبر ضرور لگایا جائے اور کھڑے زبر کو جزو املا سمجھا جائے۔ جس طرح حکم دیا گیا تھا کہ اوس اور اس۔ اودھر اور ادھر میں واو نہیں لکھا جائیگا مگر پیش اور زیر لگانا لازم ہوگا۔

استغنا پہلے بھی تھا اور اب بھی کیا جا رہا ہے۔ کہا جاتا کہ عربی ترکیبوں مثلاً اعلی اللہ مقامہ وغیرہ میں یٰ لکھنے کی اجازت ہے۔ حتی الامکان میں یٰ کی اجازت ہے۔ لیکن اگر حتی کے آگے کاف بیانیہ ہو تو سیدھے الف سے حتا کہ لکھو ــــ وغیرہ

یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ وہ عربی ترکیب ہے اور یہ فارسی۔ اگر پہلے کا مروجہ املا آپ کے نزدیک دماغی پراگندگی کا سبب تھا تو اب یہ انقلاب پہلے سے زیادہ پراگندگی بلکہ وحشت کا موجب ہوگا۔ اور بہت سی خرابیوں کا سبب بنے گا۔ مثلاً ایک ادارے کا تاریخی نام "دار الہدیٰ والوعظ" ہے۔ اس کے اعداد (۱۲۶۸) ہیں۔ یہ اس کا سالِ تعمیر ہے۔ مورخ کا قلم جو اس نئے انقلاب کا خوگر ہو جائے گا اور اپنی تحریر میں اعلا، ادنا، مصطفا، وغیرہ لکھے گا وہ یہاں دار الہدا لکھ دیگا۔ مادۂ تاریخ غلط ہو جائے گا۔

قدیم خوبصورت اور حامل روایات الفاظ کی شکل صورت بھی بگاڑ دی جائے اور پھر بھی کلیہ نہ بن سکے تو انقلاب لانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ صدیوں سے سب جانتے ہیں کہ اردو میں ایک ایسا الف بھی ہے جو بشکل یٰ لکھا جاتا ہے اور کبھی صرف کھڑے زبر سے کام لیا جاتا ہے۔

مسجد اقصیٰ، من و سلویٰ، دم عیسیٰ، عصائے موسیٰ، علی مرتضیٰ، ملا اعلیٰ، وغیرہ ان الفاظ کے ساتھ جو روایات وابستہ ہیں ان کو ادب و تاریخ کے صفحات سے محو نہیں کیا جا سکتا۔ اور بغیر اُن روایات کے ان الفاظ کے معانی اور مواقع استعمال سمجھ میں بھی نہیں آسکتے۔ اُنھیں اَن مٹ روایات میں سے ان کا یہ املا بھی ہے کہ آخر میں الف بشکل یٰ لکھا جاتا ہے۔

متقدمین نے بھی چند الفاظ کو اشتباہ و التباس سے بچنے کے لئے مستثنیٰ کیا

تھا۔ یعنی الف مقصورہ کو سیدھے الف کی صورت میں لکھنا پسند کیا تھا شلاً

مصلّٰی۔ اسم ظرف ہے۔ اسم فاعل مصلّی بھی اردو میں بولا جاتا ہے۔ اشتباہ سے بچنے کے لئے اسم ظرف کو الف سے لکھا جاتا ہے۔

مربّٰی۔ تربیت سے اسم مفعول ہے۔ اس کا اسم فاعل مربّی بھی اردو میں ہے۔ لہٰذا اسم مفعول کو الف سے لکھا جاتا ہے۔

مدّعٰی۔ ادّعا کا اسم مفعول ہے۔ اسم فاعل مدّعی اردو میں رائج ہے۔ امتیاز کے لئے اسم مفعول کو الف سے لکھا جاتا ہے۔

مصفّٰی۔ تصفیہ کا اسم مفعول ہے۔ اسم فاعل مصفّی بھی اردو میں رائج ہے۔ لہٰذا اسم مفعول کو الف سے لکھا جاتا ہے۔

مقتضٰی۔ اقتضا کا اسم مفعول ہے۔ اس کو الف سے لکھا جاتا ہے۔ مقتضِی اسم فاعل ہے۔

مقتدٰی۔ اقتدار کا اسم مفعول ہے۔ اس کو الف سے لکھا جاتا ہے۔ مقتدِی اسم فاعل ہے۔

مجلّٰی۔ تجلیہ کا اسم مفعول ہے۔ اس کو الف سے لکھا جاتا ہے۔ اس کا اسم فاعل مجلّی بروزن مقوِی۔

مولیٰ۔ اگر کھڑا زبر لکھنے سے رہ جائے تو (مُ وْ لِ ی) بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس لئے بعض لوگ الف سے لکھنے لگے۔ جیسے مولابخش۔ مولانا۔

منتہٰی۔ انتہا کا اسم ظرف ہے۔ اسم فاعل منتہی بھی اردو میں ہے۔ لہٰذا اسم ظرف کو الف سے (منتہا) لکھا جاتا ہے۔

منادٰی۔ ندا کا اسم مفعول ہے۔ اس کو الف سے منادا لکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ لفظ اردو میں رائج نہیں ہے۔ اس کا اسم فاعل منادی حاصل مصدر کے طور پر رائج ہے۔ محاورہ ہے "منادی ہو گئی"۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اُردو میں "منادی ہو گئی" کے معنی پکار دیا گیا یعنی اعلان کر دیا گیا۔ یہ منادی بضم میم ہے۔ اردو محاورے کے لحاظ سے اس میں مطلقاً اعلان کا مفہوم ہے۔ ممانعت کے لئے خاص نہیں ہے۔ فارسی قدیم وجدید

میں بھی یہ لفظ اس معنی میں موجود ہے۔ "منادی ہوگئی ہے کہ کل شاہی دربار منعقد ہوگا"
"منادی ہوگئی ہے کہ کل بادشاہ سلامت جامع مسجد میں نماز پڑھیں گے" "منادی ہوگئی
ہے کہ دربار میں کوئی ننگے سر حاضر نہو" وغیرہ۔ صاحب فرہنگ آصفیہ نے اس کے میم پر زبر لگایا
ہے وہ غلط ہے۔

دراصل دھوکا ہوا ہے۔ بفتح میم دوسرا لفظ ہے جو خود انھوں نے لکھا ہے مناہی
یہ ممانعت کے لئے خاص ہے۔ اردو میں یہ محاورہ بھی شائع و ذائع ہے۔ مثلاً مناہی
ہوگئی ہے کوئی آدمی سیلاب کے دنوں میں پُل پر نہ جائے۔ وغیرہ

یہ دونوں محاورے دہلی میں عام ہیں اور خاص کر بیگمات کی زبان میں زیادہ
رائج ہیں۔ اور منادی کو بضم اول اور مناہی کو بفتح اول بولا جاتا ہے۔

تقاضا، تماشا، تمنا، تبرا، تولا، تجلا۔ ان میں تو الف مقصورہ نہیں تھا
تلافی اور تسلی کے وزن پر تھے۔ ایرانیوں نے "ی" کو الف سے بدل دیا۔ اُردو میں
کثیر الاستعمال ہیں اور الف سے ٹھیک ہیں۔

ماجرا۔ مؤرد ہونے کی وجہ سے الف سے درست ہے۔

مندرجہ بالا الفاظ کا استثنا معقول وجوہ کی بناپر تھا۔ من کل الوجوہ ایرانی
کارروائیوں کی پیروی ہم پر فرض نہیں ہے۔ تقویٰ، عیسیٰ، موسیٰ، دعویٰ۔ اُردو میں
"بیائے معروف" نہیں بولے جاتے۔ ان کا تسلی تشفی کے ساتھ قافیہ باندھنا محض
فارسی ادب کی تقلید ہے۔ فصحائے اردو کا ذوق اس کو قبول نہیں کرتا۔

اضافت کی صورت میں چونکہ ایک (ے) کا اضافہ کیا جاتا ہے اس لئے (یٰ)
کو الف کی شکل دیدی جاتی ہے تاکہ اجتماع یائین نہو۔ جیسے دعوائے وفا، لیلائے شب
یہ ایک ضرورت تھی۔ اس کو دلیل بنا کر اصل وضع و ہیئت کو نہیں بدلا جائے گا۔ دم عیسیٰ
عیسیٰ دم ان میں تبدیلی نہیں ہوگی۔

ہاں ایک تبدیلی بہت پسند آئی۔ لفظ متوفیٰ کو سیدھے الف سے لکھنا چاہیئے
تاکہ اس کے تلفظ کی اصلاح ہوجائے۔ اور میں بھی انشاء اللہ متوفا لکھنے کی کوشش
کروں گا۔ عادت پڑتے پڑتے پڑہی جائیگی۔ جب سب لوگوں کا تلفظ درست ہوجائیگا
تو منادی کرادی جائیگی کہ اب الف مقصورہ سے لکھو۔

فاضل مصنف نے بعض ایسے الفاظ کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جو عربی ترکیب
استعمال ہوتے ہیں اور مشورہ دیا ہے کہ ایسے الفاظ سے اجتناب کیا جائے۔
علی الحساب، علی الصباح، علی الترتیب، علی الاعلان۔ حتی الامکان حتی المقدور
رہ۔ شاید یہ ذہن میں نہیں رہا کہ علی الحساب کا لفظ تو ان پڑھ عوام اور بنیے بھی
تے ہیں۔ اس کو قاعدے سے مستثنیٰ کیوں کیا گیا؟ ایسے ہی بقیہ الفاظ بھی رائج
۔ ان الفاظ میں (یٰ) لکھنے کی اجازت دی گئی۔ لیکن تعالیٰ، مصطفیٰ وغیرہ
سخ کرنے کا حکم دیا گیا۔ شعر

ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن نعتِ شہ کونین و مدیح کے وجم را (عرفی)

ارشاد ہوا ہے کہ حتی الامکان اور حتی المقدور کے الفاظ سے پرہیز کرو۔ اس کی
۔ بآسانی امکان بھر، مقدور بھر، لکھا جا سکتا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ لکھنے میں
دں؟ بولنے میں بھی پرہیز کیا جائے۔ یہ احسان بھی کیوں گوارا کیا جائے؟ سکت
ر کیوں نہ لکھا اور بولا جائے؟

بدرالدجیٰ، نورالہدیٰ، عیدالاضحیٰ وغیرہ کیا عربی ترکیبیں نہیں ہیں؟
ن کو سیدھے الف سے لکھنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ کیوں؟

اولیٰ کو اگر الف سے اولا لکھا جائے تو اس میں اور اولا بمعنی ژالہ میں۔
ر اسی طرح مادیٰ کو اگر الف سے لکھا جائے تو اس میں اور ماوا بمعنی کھو یا ہیں
یہ الامتیاز کیا ہوگا؟

چوں کے لئے بھی یہ مشکل نہیں۔ اردو املا انگریزی زبان کے املاسے زیادہ
مشکل اور مغلق نہیں ہے۔ جس طرح بچے ذ، ز، ض، ظ۔ اور ہ، ح۔ اور ا،
ع والے الفاظ میں امتیاز کر لیتے ہیں اور آپ ان کو امتیاز کرنا سکھاتے ہیں۔ اسی
طرح اس میں بھی امتیاز کریں گے۔

یہ خیال غلط ہے کہ آدمی بنیادی قاعدہ پڑھ کر زبان سیکھتا ہے۔ حقیقت یہ
ہے کہ ہر ایک آدمی ماں کی گود میں زبان سیکھتا ہوا مکتب میں آتا ہے۔ مثلاً تھوڑی سی
حرفوں کی پہچان ہو جانے کے بعد آپ اس کے سامنے مندرجہ ذیل جملے لکھ کر رکھیے:۔

آج پیر کا دن ہے۔ میرے پیر میں درد ہے

دیکھو شیر کے دہاڑنے کی آواز آرہی ہے۔ آؤ شیر خرما کھالو۔
میں ایک چور کو پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے دوڑا۔ تھک کر چور ہو گیا
۔ مذکورہ جملوں میں پیر، شیر اور چور کا تلفظ بتانے کی آپکو ضرورت نہیں پڑیگی۔
نہ کسی امتیازی علامت کی حاجت ہے۔ ان الفاظ کے معنی ماں کی گود میں سیکھ چکا
ہے۔ معنی سے خود بخود امتیاز کریگا۔ اور جتنا وہ آگے بڑھے گا بڑوں کی صحبت میسر
آئے گی۔ بڑی کتابیں پڑھے گا نئے الفاظ سامنے آتے جائیں گے۔ ان کے معانی کے
ساتھ ساتھ ان کے املائی نقوش بھی اس کے ذہن پر مرتسم ہوتے جائیں گے۔ بشرطیکہ
اسی انداز پر اس کو سکھایا اور پڑھایا جائے۔ اس میں سیاق وسباق کا فہم بھی
بہت بڑا معاون ہے۔ یہ جماعت ادنیٰ کے بچے اور اعلیٰ درجے کے فاضل انسان
کے لئے یکساں اہم اور ضروری ہے۔

یہ سب کچھ سکھایا جاتا ہے۔ خود نہیں آتا۔ لیکن اگر شروع سے اس کو
علامات اور زیر زبر اور شوشوں اور لٹکنوں کی بھول بھلیاں میں الجھا دیا جائے
اور پابند بنا دیا جائے تو اس کا ذہن سیاق وسباق اور معانی کی طرف منتقل ہونے
کے بجائے علامات کو ٹٹولتا رہے گا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس بھول بھلیاں نے بچوں
کی اپج اور ترقی کی صلاحیت کو کمزور کر دیا ہے۔

جس مقصد سے یہ کاٹ چھانٹ کی جارہی ہے اور اس کو اصلاح کا نام دیا
جارہا ہے وہ مقصد پورا نہیں ہوگا۔ اردو مصنفین اور شعرا کو انعامات بھی دئیے
جائیں گے۔ خطبات صدارت میں اردو کی مٹھاس کی تعریف بھی کی جائیگی۔ مشاعرے
بھی ہوتے رہیں گے۔ سمینار بھی ہوں گے۔ اردو کے گانے بھی دلچسپی سے سنے جائینگے۔
گھٹیا اور پھسپھسے کلام میں فلسفیانہ نکات ٹھونس ٹھونس کر ان پر طویل وعریض و
عمیق خطبات مع پیش لفظ اور مقدمات بھی لکھے جائیں گے۔ یہ سب کچھ ہوگا لیکن اردو
بھارت کی سرکاری زبان نہیں بن سکتی۔ اور خدا کرے نہ بنے۔ اگر بن گئی تو اس تراش
خراش سے جو کچھ باقی بچے گی وہ بھی فنا ہو جائیگی۔

جب کسی کتاب کو جدید طباعت کے لئے ایڈٹ کیا جاتا ہے یا کسی کتاب میں
سے کوئی اقتباس نقل کیا جاتا ہے تو یا تو خود مصنف کے طرز تحریر اور املا کو یا اس

عہد کے عام اور رائج املا کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ مثلاً لفظ پانو کا جو املا مرزا غالب نے اختیار کیا ہے اگر ان کا شعر کہیں نقل کیا جائے تو اسی املا کے مطابق لکھنا چاہیے ۔ اس امر کو "اردو املا" میں نہ صرف تسلیم کیا گیا ہے بلکہ پُرزور طریقے پر لکھا گیا ہے ۔ مگر افسوس کہ اسی کتاب میں جگہ جگہ اس منصفانہ قاعدے کی خلاف ورزی بھی کی گئی ہے ۔ مثلاً ص۶۴ کے حاشیے میں انشا کا شعر اس طرح نقل کیا گیا ہے :۔

یا بارِ الٰہ ! مصطفٰا کا صدقہ　　اولادِ بتول و مرتضٰا کا صدقہ

یہ شعر کلیات انشا نولکشوری مطبوعہ ۱۸۶۴ء کے صفحہ ۳۸۹ پر ہے ۔ الہ کے لام پر مد ہے ۔ کھڑا زبر نہیں اور نیچے شوشہ جس کو شکن نام دیا گیا ہے ۔ وہ بھی نہیں ہے ۔ مصطفے مرتضے میں الف مقصورہ بشکل (ے) لکھا ہوا ہے ۔ لیکن یہاں ناقل نے املا بدل کر اپنی مرضی کے مطابق لکھا ہے اور ذرا سی چوک پھر بھی ہو گئی ہے ۔ صدقہ کو اپنے بنائے ہوئے قاعدے کے مطابق الف سے نہیں لکھا ۔

رحمان ، سلیمان ، ابراہیم وغیرہ ص۶۱

کھڑے زبر کو سیدھے الف کی صورت میں لکھنے کی تجویز سے کسی کو اختلاف نہیں ۔ پہلے ہی سے ان میں سے اکثر الفاظ کو الف سے لکھا جاتا ہے ۔ مثلاً سلیمان ، ابراہیم ، نجات ، حیات ۔ لیکن صلاۃ ، زکات ، میں لمبی ت نہیں لکھی جا سکتی ۔ یہ الفاظ اصطلاحی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ہاں صلہ کی جمع صِلات لمبی ت سے لکھی جائے گی ۔ اور بہتر یہ ہے کہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کو قرآنی املا کے مطابق لکھا جائے ۔

قرآن کی آیات کو نقل کرتے وقت محتاط لوگ قرآن مجید کو سامنے رکھتے ہیں ۔ محض یادداشت سے لکھنے میں قرآن کا مخصوص رسم الخط اکثر قائم نہیں رہتا ۔ مثلاً اردو املا کے ص۶۶ پر جو آیت نقل کی گئی ہے فاعتبروا یااولی الابصار اس میں یا کے آگے الف نہیں لکھا جاتا ۔ قرآن میں یٰٓاُولی ہے ۔ یہ غفلت اور سہل انگاری نامناسب ہے ۔ نظم قرآن کی طرح اس کے رسم الخط کی بھی پوری حفاظت کی گئی ہے ۔

اللہ صـ ۶۴

فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ :۔ لفظ اللہ کی کتابت اردو میں ایک خاص طرح ہوتی ہے کہ دوسرے لام کی جگہ ایک شوشہ سا بنا دیا جاتا ہے۔ اس لفظ کی یہی رائج اور متعارف صورت ٹھیک ہے اور اس کو اسی طرح لکھنا چاہیے"۔

اگر صرف اتنا لکھ دیا جاتا کہ "لفظ اللہ کا مشہور و متعارف املا جو پہلے سے رائج ہے وہی قائم رہے گا" تو کافی ہوتا۔ لیکن جو تشریح کی گئی اور ہیئت بتائی گئی اور بعینہٖ وہی ہیئت ساری کتاب میں اختیار کی گئی وہ رائج اور متعارف صورت نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس میں بھی آپ نے املائی تصرف کر ڈالا۔ آپ کی طرح بعض اور مصلحین نے بھی اس لفظ کو تختۂ مشق بنایا ہے۔ یہاں اصول خطاطی پر اصرار کیا جاتا ہے۔ ویسے خلاف ورزیاں اتنی عام ہیں کہ دیکھتے دیکھتے دماغ پریشان ہو جاتا ہے۔ شوشوں کی طرف سے بے پروائی اور غفلت عام ہو چکی ہے۔ جسکی سیکڑوں مثالیں خود اسی کتاب "اردو املا" میں موجود ہیں۔

تحفۃً ، دفعۃً ، حقیقۃً ، وغیرہ کو تحفتہً ، دفعتہً ، حقیقتہً یعنی باضافۂ شوشہ لکھنا۔ سا اور سنا کو یکساں لکھنا۔ (ب) کے ساتھ خط شکستہ کی طرح لمبی (ر) لگانا۔ ہُند وغیرہ میں سے (ہ) کی گھنڈی غائب کر دینا۔ بلا وجہ بلا ضرورت اور بغیر حرف کے کشش کھینچنا۔ وغیرہ۔ فن خطاطی کے اصول وضوابط کہیں یاد نہیں آتے۔ لیکن اسم ذات کو اصول کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ یہ ہے نقطۂ کمال اصلاح املا کا۔ چونکہ اسم ذات مستجمع صفات کمالیہ ہے۔ اس کی اصلاح بھی اصلاح املا کا نقطۂ کمال ہونا چاہیے۔

ہمارے ایک دوست بدرالحسن صاحب نے "صحت الفاظ" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے اس کے صفحہ ۶۱ و ۶۲ پر اللہ کا عجیب وغریب املا اختیار کیا گیا ہے۔ دونوں لام تین تین قط کے اس کے ساتھ ہائے ہوز کا شوشہ (ہ) کی شکل کا۔ اللہ یعنی دونوں لام ایک موٹے پیالہ نما جوڑ کے ساتھ اور ہائے ہوز کا جوڑ بھی موٹا۔ کہتے ہیں کہ قاعدہ اور اصول کے مطابق یہ شکل ہے اور اس کو اسی طرح لکھنا چاہیے۔

اب کتاب اردو املا میں ایک اور اجتہادی املا نظر آیا ہے۔ دیکھو صفحہ ۶۴ و

۶۵ و ۳۸۱ وغیرہ۔ یعنی تین قط کا لام اس کے ساتھ باریک شوشہ (جس کو مصنف نے شوشہ سا کہا ہے) پھر پیالہ او رپیالے کے سرے پہ (ہ) کا شوشہ بشکل (ر)

کاش کوئی ہمیں سمجھائے کہ اس تغیر کی ضرورت کیا پیش آگئی ہے؟

نبی امّی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب میں خط کوفی رائج تھا۔ کاتبانِ وحی نے اسی خط میں قرآن لکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوتی نامہ ہائے مبارک اسی خط میں لکھے گئے۔ مقوقس اور ہرقل وغیرہ کے نام جو نامہ ہائے مبارک ہیں ان کے عکس کتب سیرۃ میں شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی مرحوم کی تالیف "بلاغ مبین" کے ص۱۵۰ پر بھی ایک عکس چھپا ہوا ہے۔ یہ تمام کتابت حضور انورؐ کے تلفظ فرمائے ہوئے الفاظ کی ہے۔ یعنی حضورؐ نے کلام الٰہی کو بول کر لکھوایا۔ دعوتی خطوط بول کر لکھوائے۔ اور جو طرز کتابت حضورؐ کے سامنے اختیار کیا گیا آج تک امت نے اس کی حفاظت کی ہے۔

نامہ ہائے مبارک کے اندر لفظ اللہ متعدد جگہ آیا ہے۔ اس کا املا دیکھیے۔ دو لام اور تیسرا ڈنڈا جس کے ساتھ ہائے ہوز ہے۔ تینوں کی لمبائی اور اونچائی برابر ہے۔ اس کا اصل املا وہی ہے جو پہلے سے موجود تھا۔

کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ لفظ اللہ کا اصلی عربی املا جو پیغمبر کی نظر انور کے سامنے لکھا گیا وہی اُردو میں بھی رہنا چاہیے۔

خط نسخ کی ایجاد سے جب خط کوفی منسوخ ہوا تو اللہ کا املا حسب سابق رہا اور قرآن میں آج تک وہی موجود ہے۔ خط ثلث وغیرہ میں بھی اسی کے مطابق یا قریب قریب ہے۔

پھر جب خط نستعلیق میر علی تبریزی کی ہنرگاہ سے اپنی نوک پلک اور جوڑ پیوند کی نزاکتیں لیکر آیا تو اللہ کے املا کی امتیازی حیثیت قرار دی گئی جو فارسی اور اردو رسم الخط میں آج تک موجود ہے۔ رائے اور فہم کا اختلاف جو ایک قدرتی امر ہے۔ اس نے اسلام کے اندر بہت سے مذہبی فرقے تو بنا دیئے لیکن لفظ اللہ کے بارے میں کسی فرقے کے علما اور باشعرا اور خطاطوں کی طرف سے کوئی اختلاف بروئے کار نہ آیا۔

اس کی شکل وصورت کیا ہے؟ ہمارے استاد مرحوم نے فرمایا تھا کہ اس کا لکھنا بہت آسان ہے۔ پورے قط سے دو ملے ہوئے نقطے گہرائی دیکر پیالہ نما بناؤ پھر شروع

میں ایک قطعی لمبائی کا (ب) والا شوشہ لگا دو۔ آخر میں ذرا سی نوک (ہ) کی کھینچ دو (یہ خیال رہے کہ ہ کا شوشہ (ر) کی شکل کا نہیں ہوگا) پھر بیچ والے شوشے پر تشدید اور کھڑا زبر لگا دو۔

کہا جاتا ہے کہ نستعلیق میں اس لفظ کے تینوں ڈنڈے برابر کیوں نہیں رکھے گئے؟ بہلا اگر ایک قط کا رہا تو دوسرے دو کی صرف نوکیں رہ گئیں۔ جواب یہ ہے کہ تشدید اور کھڑے زبر کو اس صورتِ املا میں لازمی جزو املا قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ التزام بھی اس کی امتیازی شان ہے۔ اور تاج شاہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے لئے جگہ نکالی گئی ہے۔ اگر ڈنڈوں کے اوپر تشدید اور کھڑا زبر ہوتا ہے تو اونچائی زیادہ ہونے کی وجہ سے اوپر کی سطر سے ٹکراتا ہے۔ غرضکہ یہ املا نہایت متناسب اور حسین ہے۔ اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔

ابلہ صـ۶۸

فاضل مصنف نے لفظ ابلہ کی تشریح میں لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں احمق، سادہ لوح "جسکو طنز کی راہ سے جنتی بھی کہتے ہیں"

اَبْلَہٗ عربی میں ایسے شخص کو کہتے ہیں جو سیدھا سادہ بھولا بھالا ہو۔ جس میں چالاکی اور فطانت نہ ہو۔ احمق اور بے عقل مجازی معنی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے۔ اَکْثَرُ اَھْلِ الْجَنَّۃِ بُلْہٌ۔ ابلہ کی جمع بُلْہٌ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اکثر اہل جنت بھولے بھالے ہونگے یا اکثر بھولے بھالے جنتی ہوتے ہیں۔

مشہور مصرع ہے۔ چوں قضا آید طبیب ابلہ شود۔ یعنی کوئی تدبیر نہیں سوجھتی، بھولا بھالا یا اناڑی ہوجاتا ہے۔ اس مصرع کے اعداد ۱۳۴۶ھ ہیں۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کا سال وفات یہی ہے۔ ابلہ کے معنی احمق سمجھنا غلطی ہے۔ مذکورہ حدیث میں اور مصرع میں یہ معنی مراد نہیں ہیں۔ قائل کا مقصود اگر طنز ہوگا تو طنز ہوگا ورنہ اس میں طنز کا کوئی پہلو نہیں۔

الف لام صـ۷۲

فاضل مصنف لکھتے ہیں:۔ ایسے مرکب لفظ اردو میں اچھی خاصی تعداد میں مستعمل ہیں جنھوں نے عربی قاعدے کے مطابق "الف

لام" کے ساتھ ترکیب پائی ہے ۔ جیسے فی الحال ، بالکل ، بالفعل انا الحق، ملک الموت ، عظیم الشان، شجاع الدولہ، وغیرہ۔ ایسے مرکبات کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ کچھ مرکبات میں الف اور لام دونوں تلفظ میں نہیں آتے۔ جیسے عظیم الشان ، بالترتیب ۔ اور کچھ مرکبات میں صرف الف تلفظ سے خارج رہتا ہے ، لام شامل تلفظ ہو جاتا ہے جیسے ملک الموت ، بالکل ۔ قواعد نویسوں نے تقسیم اس طرح کی ہے کہ الف لام کی ترکیب کے لحاظ سے حروف تہجی کی دو قسمیں ہیں۔ حروف قمری یعنی وہ حروف جن سے پہلے اگر الف لام آتا ہے تو لام شامل تلفظ رہتا ہے ایسے حروف یہ ہیں ۔ ب ج ح خ ع غ ف ق ک م و ہ ی۔ اور حروف شمسی ، وہ حرف کہ ان کے اول جب الف لام آتا ہے تو لام شامل تلفظ نہیں ہوتا یہ حرف ہیں ۔ ت ث د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ل ن ۔ اردو املا میں اس الف لام کو لازماً لکھا جائے گا۔ آگے لکھتے ہیں :۔ والشمس ، بالترتیب ۔ لام کے بعد والے حرف پر تشدید اور الف سے پہلے والے حرف پر اس کی حرکت یہ دو چیزیں اس بات کے اظہار کے لئے کافی ہونگی کہ یہاں الف لام خاموش حروف کی حیثیت رکھتے ہیں اور شامل تلفظ نہیں ۔

فاضل مصنف کی مذکورۂ بالا عبادت میں ابہام ہے ۔ میں کچھ وضاحت کرنا چاہتا ہوں ۔ ہم جس کو الف لام کہتے ہیں یہ دراصل صرف لام ہے ۔ جو معرفہ بنانے کے لئے نکرہ اسموں کے شروع میں آتا ہے ۔ اس کو لام تعریف کا نام دیا گیا ہے ۔ یہ ہمیشہ ساکن ہوتا ہے ۔ چونکہ ابتدا بسکون عربوں کے نزدیک محال ہے ۔ اس لئے لفظ مقرد میں اس سے پہلے الف مفتوح بڑھاتے ہیں ۔ جیسے قدیر ۔ اَلقدیر یہ الف وصل ہے ۔ اس کی بالکل وہی حیثیت ہے جو لفظ اسکول و اسٹیشن کے الف کی ہے جو ہم نے آسانی تلفظ کے لئے بڑھایا ہے ۔

عربی میں قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی لفظ ایسے لفظ کے شروع میں آکر ملے گا تو الف کا کام ختم ہو جائیگا یعنی تلفظ میں نہیں آئیگا ۔ لیکن کتابت میں باقی رہے گا۔

عبدالقدیر میں الف نہیں پڑھا جاتا ۔ لیکن لام تعریف اگر تلفظ میں سے خارج ہوجائیگا تو اسم پھر نکرہ ہوجائے گا اور پھر کتابت میں سے بھی الف لام دونوں خارج ہوجائیں گے ۔

حروف شمسی لام کے قریب المخرج حروف ہیں ۔ تو جن لفظوں میں پہلا کوئی حرف شمسی ہے ان میں لام تعریف کو اس حرف سے بدل کر ادغام کردیتے ہیں ۔ اس صورت میں لام کے بجائے اس حرف کا تلفظ ہوتا ہے ۔ کتابت میں الف لام دونوں باقی رہتے ہیں ۔ مثلاً شمس الدین کا تلفظ یہ ہے :۔ (شَ مْ سُ دْ دِ یْ نْ) سین کے بعد جو دال ہے وہ لام کے بدلے میں آئی ہے ۔

الف اور ہائے مختفی ض ۸۱

فارسی اور اردو میں بعض حروف ہجا کی کئی شکلیں ہیں ۔ مثلاً س ہس ۔ ہ ۃ ھ ۔ ی ، ے ۔ عربی میں بھی علی ہذا بعض حروف کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً ت ، ۃ ، ۃ ۔ ر ، س ۔ ک ، ک ۔ م ، م ۔ ہ ، ہ ، ۃ ۔ ی ۔ ے ۔

عربی میں ت کے تلفظ کی دو حالتیں ہیں ۔ ایک وہ جس کا تلفظ نہیں بدلتا ۔ وہ لمبی لکھی جاتی ہے ۔ آیات ، صدقات ، بینات ، اوقات ، اثبات وغیرہ ۔ دوسری وہ جو حالت وقف میں ہائے ہوز کا تلفظ اختیار کرلیتی ہے اور گول لکھی جاتی ہے ۔ جیسے ارادۃ ، ارادہ ۔ عقیدۃ ، عقیدہ ۔ راضیۃ مرضیہ ، واقعہ ۔

جب اس کو ساکن کیا جاتا ہے تو اس کا تلفظ ہائے ہوز کے تلفظ سے بدل جاتا ہے ۔ مگر کتابت میں اس کی شکل بھی بدستور رہتی ہے اور دو نقطے اور تنوین بھی قائم رہتی ہے ۔ آگے آیت کہہ کر وقف کرنا بتایا جاتا ہے ۔ قرآن میں بھی اور عربی کی عام کتابوں میں بھی املا مدور ہی رہتا ہے ۔ اور نقطے بھی لکھے جاتے ہیں ۔ امتیاز کے لئے مستقل ت کو لمبی شکل میں لکھتے ہیں اور تلفظ بدلنے والی کو ہائے مدور کی شکل میں لکھ کر دو نقطے لگا دیتے ہیں ۔

اہل فارس نے تائے مدور والے الفاظ کے دونوں تلفظ قائم کرکے معنی میں بھی تنوع پیدا کیا اور اس سے زبان میں وسعت اور حسن بڑھ گیا ۔ احمد بن یار کا جو اقتباس کتاب میں منقول ہے اس میں وہ اس تصرف کو حسن تصرف اور استفادہ لطیف

کے الفاظ سے ذکر کرتا ہے اور مندرجۂ ذیل مثالیں تحریر کرتا ہے۔

مراجعت، بازگشت از مکان۔ مراجعہ، رجوع باشخاص و اشیا۔ ارادت، اخلاص و محبت۔ ارادہ، خواستن و قصد کردن۔ اقامت، ماندن و توقف کردن۔ اقامہ برپائے داشتن۔ نوبت، دفعہ و بار۔ نوبہ، تپ مخصوص۔ رسالت، پیغام دادن و پیام بردن۔ رسالہ، کتاب و نامہ۔

اردو میں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ جیسے :۔

ارادت، مریدانہ خلوص و محبت۔ ارادہ، قصد و نیت۔ عقیدت، مریدانہ خلوص و احترام، عقیدہ، رائے راسخ و محکم۔ رسالت، پیغمبری۔ رسالہ کتاب و مکتوب۔ جلوت، مجلس نشینی۔ جلوہ، نمودِ حسن۔ فطرت، نیچر و پیدائش۔ فطرہ، صدقۂ فطر۔ رذالت، کمینگی۔ رذالہ، کمینہ۔ طریقت، سلوک و ریاضت، طریقہ، راستہ اور طرز۔ زلت، لغزش۔ زلہ، گری ہوئی چیز جیسے روٹی کا بھورا۔ کتابت، لکھنا۔ کتابہ، کتبہ۔ کسالت، ہلکے کام کو بھاری سمجھنا اور کاہلی کرنا۔ کسالہ، سختی و دشواری۔ اضافت، نسبت۔ اضافہ، زیادہ کرنا۔ زیادت، زیادہ کرنا بڑھانا۔ زیادہ، بڑھائی ہوئی چیز۔ معاشرت، معنی مصدری میں۔ معاشرہ، حاصل مصدر۔ مراسلت، خط و کتابت۔ مراسلہ، بھیجا ہوا طویل خط یا تحریر۔

واضح ہو کہ ت کا تلفظ قائم کرنے کی صورت میں اس کو مستقل ت کی طرح لمبی شکل میں لکھا جاتا ہے۔ فاضل مصنّف نے اس باب میں بہت مفید بحث کی ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ہائے مختفی صرف فارسی میں ہے اور اس کا فائدہ صرف اسی قدر ہے کہ وہ حرکتِ ماقبل کو سہارا دیتی ہے۔ کیونکہ لفظ کا اختتام حرف متحرک پر نہیں ہو سکتا۔ ہندی میں ہائے مختفی کے بجائے الف سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ اُردو میں کچھ ایسی غلط نویسی رواج پا گئی کہ اردو اور ہندی الفاظ میں بھی فارسی کے قیاس پر ہائے مختفی لکھنے لگے۔ مثلاً لہسوڑہ، چونہ، سہرہ، ہیرہ وغیرہ

اس بحث میں مصنف نے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، احمد بہن یار، مولٰنا امتیاز علی عرشی، شیرانی صاحب مآثر الامراء، قواعد اردو عبدالحق، احسن مارہروی، کے اقوال بھی دیئے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار کے اقتباس کا آخری ٹکڑا یہ ہے:۔

" اسی سے ایک کلیہ ہاتھ آیا کہ جب کسی اور زبان کا لفظ اردو
میں دوسرے معنی اور اسی کے ساتھ دوسرا تلفظ اختیار کرلے تو
اس کا املا ٹھیٹ اردو لفظوں کی طرح ہونا چاہیئے "۔

یہ کلیہ جو مالِ غنیمت کی طرح ہاتھ آگیا ہے ۔ خود ڈاکٹر صاحب نے اس سے چند الفاظ کو مستثنیٰ کیا ۔ پھر لفظ طرّہ کو ہائے مختفی سے لکھ کر کلیہ کی خلاف ورزی کی ۔ طرہ عربی لفظ ہے اور یہاں اصلی معنوں میں استعمال نہیں ہوا ہے ۔ ان کے کلیے کے مطابق اس کو الف سے لکھا جانا چاہیئے تھا ۔

میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بعض مورد اور بعض اردو الفاظ کو اور مرکبات کو بھی میں الف کے بجائے ہائے مختفی سے لکھنا مرجح سمجھتا ہوں ۔ جیسا کہ آگے عرض کیا جائے گا ۔

مندرجہ بالا کلیہ کے قیاس پر فاضل مصنف نے بھی ایک اصول اور ایک قاعدہ تصنیف کر ڈالا ۔ لکھتے ہیں :۔

" اس کے مطابق اب اصول یہ قرار پایا کہ جن مرکبات کا صرف
ایک جز فارسی یا عربی کا ہے ان کو اردو مرکب مان کر الف سے
لکھا جائیگا ۔ اسی طرح یہ قاعدہ بھی بنا کہ جن مرکبات کے دونوں
جز فارسی عربی کے ہوں مگر کسی ایک جز یا دونوں اجزا میں کوئی
ایسی تبدیلی ہوگئی ہو جو اردو سے مخصوص ہو تو اس کو بھی اردو
مان کر الف کے ساتھ لکھا جائیگا ۔ جیسے صبح خیزیا ، دومنزلا ،
نودولتا ، پیچ رنگا ، بزدلا ، ناشکرا ، دورخا وغیرہ

اپنی تائید میں انشا کا قول دریائے لطافت سے نقل کیا ہے :۔

" پیالا ، ستارا ۔ یہ پیالہ ، ستارہ تھے ۔ تمام فارسی لفظوں کے آخر
کی ہ اُردو میں الف سے بدل جاتی ہے ۔

کیا خوب ! ایک سرے سے ستھراؤ کرنا شروع کر دیا ۔ کیا پیالہ ، ستارہ کی طرح بندہ ، اندیشہ ، دل گرفتہ ، زندہ ، مردہ ، شرمندہ ، شیشہ ، آبگینہ ، آئینہ وغیرہ سب کو الف سے لکھا جائیگا ؟ انشا کے اس قول کو کس کا ذوقِ سلیم گوارا کرلے گا ؟

اور خود کلیاتِ انشا میں ان کے من گھڑت قاعدہ کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ دیکھیئے کلیاتِ انشا مطبوعہ نولکشور ۱۸۹۴ء ص ۱۰ و ۹۳ و ۱۲۵ و ۱۳۲۔ بوسہ، مزہ، مژدہ، پردہ، دستہ۔ اور دیکھیے ص ۳۴۲۔ بسیرا، ماتھا کے قافیے میں لیلیٰ کو الف مقصورہ اور میوہ کو بہائے مختفی لکھا ہے۔

فاضل مصنف نے اردو الفاظ کی ایک طویل فہرست دی ہے اور حکم دیا ہے کہ ان سب کو الف سے لکھا جائے۔ ان میں بہت سے عربی فارسی الفاظ بھی شامل کردیئے ہیں۔ میں مندرجہ ذیل الفاظ کو الف سے لکھنا درست نہیں سمجھتا:۔

(۱) آوہ۔ خالص فارسی لفظ ہے معنی وغیرہ میں کوئی تصرف نہیں ہوا۔ الف سے لکھنے کی کوئی وجہ نہیں (آصف اللغات)

(۲) ادلہ۔ دراصل عربی لفظ عضلہ ہے۔ ایسے پٹھے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ گوشت شامل ہو۔ جس کو اردو میں مچھلی کہتے ہیں۔ یہ ایسا ہی لفظ ہے جیسے ہودہ (اور ہودی) کہ دراصل حوضہ تھا۔ نشانی کے طور پر کم از کم ہائے مختفی کو باقی رہنا چاہیے۔

(۳) آنہ:۔ کو ہائے مختفی سے لکھتے ہوئے صدیاں گذر گئیں۔ صاحب فرہنگِ آصفیہ نے اس کی اصل جو لکھی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس کی ہائے ہوز سین سے تبدیل ہوئی ہے لہٰذا جز و مادّہ ہے۔ فارسی والے بھی بہائے مختفی لکھتے ہیں۔ سکوں پر بھی ہمیشہ سے اسی طرح لکھا جاتا رہا ہے۔ پھر اس میں اور آنا مصدر میں مابہ الامتیاز یہی ہائے مختفی ہے۔

(۴) بٹہ:۔ آلات وزن اور خسارے کے معنی میں بہائے مختفی اور اصطلاح حساب بروزن وفا کے معنی میں بالف لکھنا چاہیے۔

(۵) بچارا:۔ پڑھے لکھے اور شایستہ لوگ بیچارہ بولتے ہیں۔ فارسی لفظ ہے۔ علاج و تدبیر کے معنی میں آپ خود لفظ چارہ کو فارسی مانتے ہیں۔

(۶) بپتسمہ:۔ اس کا انگریزی تلفظ BAPTISM ہے۔ اردو میں اصطباغ اور فارسی میں تعمید کہتے ہیں۔ آخر میں نہ الف ہے نہ ہائے مختفی۔ الف سے کیوں لکھا جائے؟ اور ہائے مختفی سے کیوں لکھا جائے؟ کوئی وجہ ترجیح؟

(۷) بلوہ:۔ عربی لفظ ہے۔ دو طرح ہے۔ بلویٰ بروزن مولیٰ۔ بلوۃ بروزن فطرۃ ہم کہتے ہیں کہ دوسرے لفظ میں اردو والوں نے تھوڑا سا تصرف کیا ہے۔ یعنی کسرۂ اول

کو فتحہ سے بدل دیا ہے۔ بلوی اور بلوہ دونوں طرح لکھ سکتے ہیں لیکن الف سے لکھنے کا کوئی جواز نہیں۔

(۸) برآمدہ :۔ فارسی لفظ ہے۔ اردو میں آکر اصل پر قائم ہے۔ قصداً غلط لکھ کر (یعنی مد کو حذف کرکے) ہائے مختفی کے بجائے الف سے لکھنے کا حکم دینا موجب حیرت ہے۔ فارسی میں بھی مد کا تلفظ نہیں ہوتا۔ دیکھو حادثہ، ضابطہ وغیرہ میں حرف سوم مکسور ہے۔ لیکن عام بول چال میں موقوف ہو جاتا ہے محض اس تغیر کی وجہ سے یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ الفاظ اب اردو ہو گئے ہیں لہذا الف سے حادثا، ضابطا لکھو۔ ذرا ذرا سے تغیر کی وجہ سے املا کو بدلتے رہنا لغت اور ادب کی کوئی خدمت نہیں ہے۔

(۹) روپیہ، پیسہ ۔ ان دونوں کا قدیم املا صدیوں سے ہائے مختفی چلا آرہا ہے۔ قلم اور نظر اسی سے آشنا ہے۔ شاہی زمانے کے سکے اور فرامین و دستاویزات، برطانیہ کے اور اب جمہوریۂ ہند کے نوٹوں اور سکوں پر آج تک وہی املا چلا آرہا ہے۔ اب اس کو بدلنے کی کوئی معقول وجہ؟ آپ نے جو ضرب المثل لکھی ہے۔ اپنی گانٹھ نہو پیسا تو پرایا آسرا کیسا۔ صوتی قافیہ ہے اور میں نے اس بارے میں اپنی رائے دوسری جگہ ظاہر کی ہے کہ ایسے قافیوں میں الفاظ کا املا نہیں بدلنا چاہیے۔ جن لوگوں نے ہم آواز حروف مثلاً نماز و لحاظ یا اساس و خاص وغیرہ کے قوافی کو جائز رکھا انھوں نے بھی املا کو نہیں بدلا۔ میری یہی رائے ہے کہ جدا کے قافیے میں اگر صلہ، گلہ آئے تو صلہ گلہ کو الف سے نہیں لکھنا چاہیے۔

(۱۰) پیجامہ :۔ یہ کوئی سنجیدہ تلفظ نہیں ہے۔ صحیح تلفظ پاجامہ یا پائجامہ ہے۔ الف سے لکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ اور پجامہ تو آپ کے نزدیک افصح ہوگا؟ لیکن اگر ہم آپکے لکھے ہی کو صحیح مان لیں تو پے جامہ بھی خالص فارسی لفظ ٹھہرتا ہے۔ یعنی پاے اور پے فارسی میں مترادف ہیں۔ لہذا ہائے مختفی پھر بھی قائم رہیگی۔ ہاں ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ اسی معنی میں ایک لفظ پجادان بھی ہے۔ اس کو لغت میں درج کیا جائے یا نہیں؟

(۱۱) تکیہ :۔ عربی لفظ ہے۔ کچھ بھی معنی ہوں۔ الف سے نہیں لکھا جائیگا۔

(۱۲) خاکہ :۔ فارسی لفظ ہے۔ ہائے مختفی فارسی میں نسبت کے لئے بھی آتی ہے۔ جیسے

دوآبہ، دوپانیوں والا۔ پنج شاخہ، پانچ شاخوں والا۔ دوسالہ، دوسال کی عمر والا
دورُخہ، دورُخ والا۔ خاکہ کے معنی خاک والا۔ یعنی وہ شبیہہ یا کاپی جو ایک خاص
طریقے سے حاصل کی گئی ہو۔ کسی نقشے یا تحریر وغیرہ کو دوسرے کاغذ پر اتارنے کا ایک
طریقہ یہ تھا کہ اصل کی آؤٹ لائن پر سوئی سے قریب قریب سوراخ کرکے اس کاغذ کو دوسرے
کاغذ پر رکھتے تھے اور مٹی وغیرہ ایک پوٹلی میں لیکر اس پر پھیرتے تھے۔ سوراخوں میں سے
مٹی چھن کر نیچے والے کاغذ پر گرتی تھی۔ پھر اوپر والا کاغذ ہٹا کر آؤٹ لائن کھینچ لیتے تھے
یہ تو تھا خاکہ اتارنا یا خاکہ کھینچنا۔ اس سے خاکہ اڑا لینا محاورہ ہے مراد نقل اتارنا
کسی کی روش اور انداز کو اپنے اندر پیدا کرنا۔

دوسرا طریقہ نقل اتارنے کا بعینہ ایسا ہی تھا جیسے آجکل کاربن پیپر کا ہے۔
اس کو چربہ اُتارنا کہتے ہیں۔ کاربن پیپر کی طرح کاغذ بنایا جاتا تھا۔

خاکہ کے ایک اور معنی بھی ہیں۔ ایسی چیزیں جو ڈلی کی صورت میں آتی ہیں۔
جیسے کتھا، چونا، ابرک، پھٹکری وغیرہ۔ ان چیزوں کا آٹے جیسا باریک چورا جس میں
گرد وغبار بھی شامل ہوتا ہے (وہ سستا بک بھی جاتا ہے) اس کو خاکہ کہتے ہیں۔
اس معنی کے لحاظ سے محاورہ بنا، خاکہ اُڑا دینا یعنی گرد کی طرح اُڑا دینا۔ رسوا کر دینا
گرد اُڑ کر ہر جگہ پہنچتی ہے۔ رسوائی میں بھی ہر جگہ نام پہنچتا ہے۔ یا گرد بنا کر بے حقیقت
کردینا۔

صاحب فرہنگ آصفیہ نے دونوں محاوروں کو گڈمڈ کر دیا۔ خاکہ اُڑا لینا اور
خاکہ اڑا دینا۔ الگ الگ محاورے ہیں۔ لفظ خاکہ کے دوسرے معنی نہ لکھنے کی وجہ
سے یہ گھپلا ہوا ہے۔

(۱۳) خیلا: بفتح اول۔ خیلا خبطی، خیلا خیطن۔ دہلی میں یہ محاورہ رائج ہے۔ اس
کے معنی ہیں پھوہڑ، بدسلیقہ، لاابالی، نیم دیوانہ جس کو اپنے کپڑے سنبھالنے کی پروا نہو۔
اس کی اصل عربی ہے خَيْعَلَة۔ بے آستین کا کرتا پہننا۔ اردو میں کثرت استعمال
اور اصل کو فراموش کرنے کی وجہ سے عین حذف ہوگیا۔ اور لفظ مورد ہو گیا۔ اس
کو الف سے ہی لکھنا چاہیے۔ واضح ہو کہ فرہنگ آصفیہ میں بھی اور لغات النسا میں
بھی خیلا کی خ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے وہ غلط ہے۔ اہل دہلی کے محاورے میں یا بفتح

رائج ہے۔

(۱۴) دَغدَغہ:- عربی لفظ ہے۔ دبا کر گھم غیر واضح بات کرنا۔ چبا چبا کر باتیں کرنا۔ کسی چیز کو چھپانا۔ گدگدی کرنا۔ طبقہ علما رہیں یہ لفظ شک و تردد کے معنی میں رائج ہے۔ اہل فارس اس کے معنی لکھتے ہیں۔ خوف، دھڑکا، تشویش، اضطراب وغیرہ ایک تصرف اہل فارس نے یہ کیا ہے کہ گدگدی کے معنی میں بکسرۂ دالین بولتے ہیں۔

اردو میں شک و تردد کے معنی میں لفظ دُگدا مشہور اور فصیح ہے۔ آصفیہ میں اس کو عوامی لکھا ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس کی اصل کی تحقیق نہیں۔ اگر یہ دغدغہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے تو املا میں ہائے مخلوط نہیں ہے۔ اور اگر بقول آصفیہ دوبدھا کا دوسرا تلفظ ہے تو دُگدھا کا املا بہائے مخلوط ہونا چاہیے۔ (میں ہمیشہ بغیر ہائے مخلوط کے لکھتا ہوں)۔

روشن، تاباں، قمقمہ کے معنی میں ہندی لفظ دَگدگا ہے۔ اس معنی میں جو لوگ غین سے بولیں ان کو آگاہ کیا جائے۔ (اول تو یہ لفظ شاذ ہے۔ پرانی کتابوں میں کہیں آیا ہو گا۔ عام طور پر تو سننے میں نہیں آتا) آصفیہ نے اس میں سخت الجھاؤ پیدا کر دیا۔ یہ کہہ کر بری الذمہ ہونے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں نے اسکو دغدغہ کر لیا ہے۔ مسلمانوں نے ہی تو ممتاز کو منتیاز۔ اسحاق کو اشاق۔ مختار کو مختیار، عائشہ کو آشیہ۔ خدیجہ بروزن عقیدہ کو بروزن زبیدہ کر لیا ہے۔ لیکن اہل لسان اور ماہرین لغت کا فریضہ کیا ہے؟ کیا صرف یہ کہہ کر بری الذمہ ہو سکتے ہیں؟ کہ "بہرحال یہ بھی ایک لفظ ہے"۔

(۱۵) دہریہ - ایک مذہبی فرقے کا نام ہے جو کائنات کو قدیم اور غیر مخلوق کہتے ہیں۔ لفظ دہریہ فرقے کی صفت ہے۔ دہریہ میں یائے نسبتی مشدد اور تائے تانیث ہے۔ فرقۃٌ دھریّۃٌ۔ اردو میں مذکر پر بھی لفظ مؤنث کا اطلاق کر دیتے ہیں۔ اصل میں ایک مرد کو دہری اور ایک عورت کو دہریہ کہنا چاہیے تھا۔ اتنا سا تصرف اس کو الف سے لکھنے کے لئے وجہ جواز نہیں بن سکتا۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے لفظ شیعہ ایک فرقہ کا نام ہے بمعنیٰ جمع بھی ہے اور مؤنث بھی۔ لیکن واحد و جمع، مذکر و مؤنث سب پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

(۱۶) ردّہ :۔ عربی لفظ ہے ۔ چونکہ ہاتھ بار بار واپس آتا ہے اس لئے ردہ نام پڑا۔ اس کو الف سے لکھنے کا کوئی جواز نہیں ۔

(۱۷) یک منزلہ وغیرہ : ۔ منزلہ میں جو ہائے مختفی ہے ۔ اس پر لفظ خاکہ کے تحت اظہار خیال کر چکا ہوں ۔ اس کو اردو ترکیب میں بھی بہائے مختفی لکھنا چاہیے ۔ مثلاً چھ منزلہ عمارت ، سات منزلہ ، بارہ منزلہ ۔ جب آپ موجِ لہو اور فوق الیھڑک جیسی ترکیبوں کو جائز سمجھتے ہیں تو چھ منزلہ کی ترکیب میں کیا خرابی ہے ؟

(۱۸) زنانہ ۔ فارسی میں لفظ آنہ جو لاحقہ کے طور پر آتا ہے ۔ وہ کبھی تو تشبیہ کا فائدہ دیتا ہے ۔ جیسے ، اقدام شجاعانہ ۔ کبھی ہیئت و حالت کو ظاہر کرتا ہے ۔ جیسے کلاہ شاہانہ یا نشست شاہانہ ۔ کبھی تواتر کو ظاہر کرتا ہے جیسے روزانہ ، ماہانہ کبھی نسبت کے لئے آتا ہے جیسے محفل شبانہ ۔ کبھی معنی مصدری کو ظاہر کرنے کے لئے جیسے باغیانہ وسرکشانہ وغیرہ (جلیم) ۔

لہذا لفظ زنانہ اگر مکان یا کپڑے وغیرہ کی صفت ہو تو الف سے لکھنے کی کوئی وجہ نہیں ۔ اور اگر زنخے کے معنی میں ہو تو الف سے ہی لکھنا چاہیے ۔ کیونکہ وہ ایک اسم جنس بن چکا ہے اور اس حیثیت سے مؤرد ہے ۔

(۱۹) زردہ :۔ فارسی لفظ ہے ۔ کچھ بھی معنی ہوں الف سے لکھنے کی ضرورت نہیں ۔ خمیازہ کیونکر لکھا جائیگا ؟

(۲۰) قتلہ ۔ عربی لفظ ہے ۔ قتل سے ماخوذ ہے ۔ تائے تانیث حالت وقف میں مبدل بہا ہو گئی ہے ۔ الف سے کیوں لکھا جائے ؟ کیا صومعہ ، قطعہ ، لامحالہ ، فوارہ ، اسلحہ سب کو الف سے لکھا جائے ؟

(۲۱) ہمالہ :۔ ایک سلسلۂ کوہ کا عَلَم ہے ۔ اس کا تلفظ سنسکرت میں دیکھا جائے ۔ آصفیہ نے جو تشریح کی ہے اس سے تو کسی طرح الف سے لکھنے کا جواز نہیں نکلتا ۔ مزید تحقیق کیجیے اور یاد رکھیے کہ عَلَم کو اپنی اصل صورت پر قائم رہنا چاہیے ۔

(۲۲) ہیجڑا :۔ دہلی میں اس کا تلفظ بیائے معروف ہے (ہ ی ج ڑ ا) اور یہ تلفظ اصل سے قریب تر ہے ۔ یہ فارسی لفظ ہیز سے بنایا گیا ہے ۔ زے کو جیم سے بدل کر آگے حرفِ تحقیر لگا دیا ۔

(۲۳) نصیبہ :۔ اردو میں اس لفظ نے کیا نیا روپ دھار لیا ہے ؟ میں نہیں سمجھ سکا۔ عربی کے اہلِ لغت نصیبۃٌ کو مؤنث النصیب لکھتے ہیں۔ خالص عربی لفظ ہے اور اپنے اصل معنی یعنی حصّے کے معنی میں مستعمل ہے۔ الف سے کیوں لکھا جائے ؟

(۲۴) نقشہ :۔ عربی کا لفظ ہے۔ اس کا نئی روپ دھارن سمجھ میں نہیں آیا۔

(۲۵) آب خورہ :۔ کو الف سے لکھنا ذوقِ سلیم قبول نہیں کرتا۔ فارسی میں بھی یہ لفظ آتا ہے اور برتن کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

(۲۶) جوتی خورا :۔ کو الف سے لکھنے میں کوئی حرج نہیں۔

(۲۷) گلہ (۲۸) صلہ، کعبہ، سجدہ، پردہ، مزہ، ستارہ۔ اگر ایسے الفاظ الف کے قافیے میں آئیں تو ہائے مختفی کو کتابت میں الف سے بدلنے کی ضرورت نہیں۔ صوتی قافیہ سے پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں۔

لفظ گلہ اور گلا۔ صلہ اور صلا۔ الگ الگ معنی رکھتے ہیں۔ التباس سے بچنے کے لئے دونوں کے املا میں امتیاز ضروری ہے۔ صفحہ ۲۰۲ پر یہ لکھا گیا ہے کہ سنس کا قافیہ بلا تردد کس، بس کے ساتھ درست ہے مگر سنس کا املا با نون غنہ ہی رہے گا۔ تو اگر ہم یہ کہیں کہ گلہ صلہ مزہ وغیرہ کا قافیہ دعا و فا کے ساتھ باندھنا جائز ہے مگر ان کا املا نہیں بدلے گا تو برا ماننے کی کیا بات ہے ؟

آپ کے بنائے ہوئے قاعدے کی رو سے لفظ دانہ وغیرہ ہائے مختفی والے الفاظ اگر الف کے قافیے میں آئیں تو ان کو الف سے لکھا جائیگا۔ مثلاً تغافل ہائے بیجا کا گلا کیا۔ اس کے برعکس اگر یہ کہا جائے کہ الف والے الفاظ ہائے مختفی کے قافیے میں آئیں تو ان کو ہائے مختفی سے لکھو تو آپ کی کیا رائے ہوگی ؟ آپکے کلیے کی رو سے تو یہ جائز ہے اور اس کی تائید میں مثال بھی موجود ہے :۔

دوش انجم زپیر فرزانہ گفت اے مرد زیرک و دانہ
شرح احباب و اقربا فرما گفت ہر کس زخویش بیگانہ
گفتم ایں عیش و عشرت دنیا گفت خواب و خیال و افسانہ

اس میں دانہ بہائے مختفی لکھا ہوا ہے۔ دیوان انجم۔ شہزادہ مرزا آسمان جاہ خلف

نواب واجد علی شاہ فرماں روائے اودھ۔ صفحہ ۳۵۲ مطبوعہ نولکشور

(۲۹) مزہ۔ خالص فارسی لفظ ہے۔ الف سے لکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔

(۳۰) دانہ بہ اور دانا کا امتیاز بہر حال ضروری ہے۔ تھکا ہارا، نہاتا ہارا، تھکا ماندہ، باقی ماندہ بہائے مختفی ہی صحیح ہیں۔

(۳۵) تعلقہ:۔ کسی معنی میں ہو، الف سے لکھنے کی ضرورت نہیں۔

(۳۶) جما جتھا۔ اس مرکب میں لفظ جما کو جمع کا بگڑا ہوا تلفظ کیوں مانا جائے۔ اگر یہ کہا جائے تو کیا خرابی ہے کہ جمنا کے معنی اکٹھے ہونے کے بھی ہیں۔ یہ لفظ جما ہوا کا مخفف ہے۔ یعنی جمی ہوئی پونجی۔

ہائے مختفی صفحہ ۱۵۱

ہندی اور فارسی میں ہائے مختفی کا وجود تسلیم کرنے کے باوجود گلہ، مزہ، حملہ، راجہ، روپیہ پیسہ کو الف سے لکھنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ خود ہی ایک نظریہ قائم کیا جاتا ہے اس سے ایک کلیہ ہاتھ آجاتا ہے۔ پھر اس سے قاعدہ بنتا ہے اور چند سطروں کے بعد بیسیوں مستثنیٰ لکھے جاتے ہیں۔ کتاب میں شروع سے آخر تک بہت سے کلیے ہاتھ آئے ہیں۔ جن کی بنیاد اپنے ہی مفروضات پر ہے۔ پھر قاعدہ بنا اور آگے چل کر خود ہی ٹوٹ گیا۔ بعض مرتبہ تو کتاب کا موضوع ہی مشتبہ ہو جاتا ہے۔ سوچنا پڑتا ہے کہ کتاب کا موضوع صرف و نحو ہے یا لغت و ادب یا منطق و فلسفہ؟

ماہرین لسانیات نے تغیرات الفاظ کے بارے میں ایک اصول قائم کیا تھا: غلط العام فصیح۔ فاضل مصنف نے اپنی اجتہادی اُپج کو شامل کر کے اس میں اتنی وسعت پیدا کر دی کہ نہ صرف غلط العوام بلکہ غلط الجہلا تک کو اس فہرست میں شامل کر دیا۔

دوسری طرف املا کے بارے میں طبیعت نے اس سے بھی زیادہ شدت سے جولانی دکھائی مگر مخالف سمت میں۔ کہ اصول و ضوابط، عرف عام، ذوق سلیم وغیرہ کو نظر انداز کر کے صحیح اور متعارف کو غلط اور مجہول بنانا شروع کر دیا۔ جس طرح الفاظ کے تغیرات کے بارے میں یہ اصول مسلم ہے کہ غلط العام فصیح اسی طرح اگر میں املا کے بارے میں یہ عرض کروں کہ غلط العام صحیح تو اس کے مان لینے میں کیا

خرابی ہے؟

آپ کہتے ہیں کہ اندازاً اور نمونۃً فصیح، فوق البھڑک فصیح۔ یعنی عربی کی تنوین اور الف لام پر قبضہ کرکے اپنا لیا۔ اور فارسی اور ہندی الفاظ میں جوڑ دیا۔ فارسی کی اضافت کو بھی اپنا لیا۔ موج لہو اور کھچڑی بے نمک بھی جائز۔ فارسی کی علامتِ جمع کو بھی اپنا لیا کہ مہاوتان، برسہا برس، بھٹیا رہا۔ سب درست۔ لیکن ہائے مختفی کو اپنا لینے سے آپ کو چڑ ہے۔ اس بیچاری نے کیا قصور کیا ہے؟

پس روپیہ کا املا اگر آپ کے نزدیک غلط ہے تو ہونے دیجئے۔ عرف عام کو بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اصلاح سے مجھے انکار نہیں ضرور ہونی چاہیے۔ مگر آنکھیں بند کرکے نہیں۔ بہت سے امور کا لحاظ رکھنا پڑیگا۔ جیسے صرف و نحو، تحقیق ماخذ، قواعد املا و خطاطی، وجوہ التباس، عرف عام، ذوق سلیم۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ پتہ بمعنی نشان اور پتا بمعنی برگ کے املا میں امتیاز رہنا مفید ہے یا دونوں کو یکساں لکھنا؟ اور کلیہ نہ تو آپ ابتک بنا سکے نہ بن سکتا ہے۔ شاید آپکو سہو ہو گیا کہ ایک تو معمولی قاعدہ ہوتا ہے اور ایک قاعدۂ کلیہ۔ معمولی قاعدہ میں تو استثنا ہوتا ہے لیکن قاعدۂ کلیہ میں استثنا نہیں ہوتا۔

ایک مسئلہ یہ بھی غور طلب ہے کہ کیا واقعی ہندی الفاظ میں ہائے مختفی کا وجود ہے؟ پاٹھ شالہ، دھرم شالہ، گئوسالہ، آریہ اناتھالیہ وغیرہ ان کا تلفظ کیا ستیہ، بھارتیہ، مدھیہ، راجیہ وغیرہ سے کچھ مختلف ہے؟ آخر میں یائے مجہول ہے یا ہائے مختفی؟ یا الف؟ ایسے الفاظ کی اصل کی تحقیق کے بعد ایک کلیہ بننا چاہیئے مگر خیال رہے کہ کلیہ میں استثنا نہیں ہوتا۔

تنوین صنا!!

فاضل مصنف تنوین پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:— ایک عام اردو والے کے لئے یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ کس لفظ کے آخر میں تائے مدور ہے اور کس کے آخر میں تائے دراز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شخص نسبۃً لکھتا ہے اور دوسرا شخص نسبتاً کو صحیح سمجھتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس معلومات کی ضرورت بھی نہیں۔

انجمن نے یہ طے کیا تھا کہ "عربی کی ۃ کو ہمیشہ اردو میں ت لکھنا چاہیے۔" مگر تنوین کے متعلق الگ سے رائے ظاہر نہیں کی تھی۔ جب اردو میں ایک ہی ت ہے تو پھر تنوین کے لئے بھی لازماً وہی عام اور یکساں طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے کہ ت کے بعد الف کا اضافہ کیا جائے۔

اب قاعدہ یہ ہوا کہ ایسے سب لفظوں کے آخر میں الف کا اضافہ کیا جائیگا۔ جیسے عادتاً، ضرورتاً، شکایتاً۔ حقارتاً الخ

کچھ لفظ ایسے ہیں جنکو فارسی اور اردو میں ہائے مختفی کے ساتھ لکھا جانے لگا جیسے نتیجہ، واقعہ، ارادہ وغیرہ ان سب لفظوں کے آخر میں تائے مدورہ ہے۔ تنوین کی صورت میں یہ بھی اسی طرح لکھے جائیں گے جیسے دفعتاً واقعتاً۔

فارسی میں اب اسی خیال کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ تنوین کے سلسلے میں تائے دراز اور تائے مدورہ میں امتیاز کی ضرورت نہیں۔ آگے اپنی تائید میں فاضل مصنف نے لغت نامہ دہ خدا کا اقتباس نقل کیا ہے۔

لغت نامۂ دہ خدا میں احمد بہمن یار نے جو کچھ لکھا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایران والوں نے بھی اس کو قبول کیا یا نہیں؟ ہمیں تو اس کے خلاف نظر آتا ہے جیمز کی ڈکشنری میں اصالۃً، امانۃً، عادۃً، حقیقۃً، رعایۃً، کلیۃً وغیرہ سب کو تائے مدور سے لکھ کر تنوین لگائی ہے۔ دوسرے یہ امر غور طلب ہے کہ کیا ہم پر ایران کی تقلید فرض ہے؟ دوسری جگہ خود آپ نے لکھا ہے:۔

یہ بات صاف طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ اردو اور فارسی دو مستقل زبانیں ہیں اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ بہت سی باتوں میں دونوں زبانوں میں اختلافات ہوں۔ املا کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں سمجھنا چاہیے۔ اور اس پر اصرار نہیں کرنا چاہیے کہ چونکہ رسم خط ایک ہے اس لئے ہر جگہ املا میں بھی یکسانی ہوگی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

(اردو املا ص ۵۸۴)

عربی کے نون تنوین کو بھی اور الف کو بھی مان لیا گیا۔ لیکن حکم یہ دیا جا رہا ہے کہ جہاں کہیں تائے تانیث ہو عام املا کے خلاف تنوین نصبی میں وہاں بھی الف لکھا جائے۔ گذارش ہے کہ اس الف کو آڑا ہی کیوں نہ دیا جائے؟ بس دو زبر کافی ہیں۔ یا نون کی شکل میں لکھا جائے۔ یہ آسان ترین کلیہ ہاتھ آ گیا۔ دونوں میں سے جو صورت پسند خاطر ہو اس کا اعلان کر دیا جائے۔ فورً، فورن۔ اتفاقً، اتفاقن۔ عادتً، عادتن۔ شکایتً، شکایتن۔ وغیرہ

عربی میں تائے زائدہ یا تائے تانیث وغیرہ گول لکھی جاتی ہے۔ اور مادہ کی اور جمع کی ت لمبی لکھی جاتی ہے۔ تنوین نصبی کی صورت میں تائے اصلی پر الف بڑھایا جاتا ہے اور تائے زائدہ پر دو زبر لگائے جاتے ہیں۔ الف نہیں بڑھایا جاتا۔ تائے جمع پر تنوین نصبی نہیں آتی۔

یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں کہ لفظ میں تائے اصلی ہے یا تائے زائدہ۔ ذرا سی توجہ کی ضرورت ہے۔ مثلاً لفظ نسبت کو لے لیجئے۔ اردو میں اس مادہ کے اور بھی مشتقات بولے جاتے ہیں۔ منسوب، مناسبت، انتساب، تناسب، متناسب، مناسب، نسب، انساب، منتسب۔ اب آپ غور کیجیے۔ ن س ب۔ ان سب الفاظ میں موجود ہے۔ یہی مادہ ہے۔ لہٰذا نسبت کی ت حروف اصلیہ میں سے نہیں ہے۔

حقیقت ۔ اس کا مادہ اردو میں تلاش کیجیے۔ حقائق، تحقیق، متحقق، تحقق، حُقہ، حق، حقانی، احقاق، حقانیت، حقیت، حقّا۔ ان سب میں ح ق ق مشترک ہے۔ معلوم ہوا کہ لفظ حقیقت میں تائے زائدہ ہے۔

حکمت ۔ حُکم، احکام، محکم، استحکام، مستحکم، حکیم، حکما، حاکم، حکومت، مُحکام، تحکم، تحکیم، حکّام، محکمہ۔ ان میں ح ک م مشترک ہے۔ معلوم ہوا کہ ان تین حروف کے سوا سب حروف زائد ہیں۔

اب تائے اصلی والے الفاظ کو لیجیے۔

وقت ۔ اوقات، موقت، موقتہ، توقیت، وقتیہ، وقتی، پنج وقتہ، وقتاً فوقتاً ان سب میں و ق ت مشترک ہے۔ معلوم ہوا کہ وقت میں تائے اصلی ہے اور موقتہ،

وقتیہ اور ربچو قتہ میں آخر کی ۃ زائدہ ہے۔ جو حالت وقف میں ہائے مختفی بن گئی ہے۔

اثبات — ثبت، ثابت، ثبوت، ثبات، ثبت۔ ان میں ث ب ت مشترک ہے۔ لہذا تائے اصلی ہے۔

واضح ہو کہ تائے اصلی والے الفاظ اردو میں بہت کم استعمال ہوتے ہیں۔ گنے چنے الفاظ ہیں ان کا یاد کر لینا بھی زیادہ مشکل نہیں۔ چند الفاظ کے لئے سیکڑوں الفاظ کے املا کو بدلنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ دو مادّے تو لکھے گئے۔ باقی مندرجہ ذیل ہیں:۔

تفاوت، فوت، متفاوت، فائت، فائتۃ

بیت — ابیات

سکوت — ساکت، سکتہ، (سکتۃ میں دوسری تائے زائدہ ہے)

سمت — سموت

صوت — اصوات

قوت — اقوات

موت — میت، اموات — ممات — موتیٰ

نعت — منعوت، نعتیہ (نعتیۃ میں دوسری تائے زائدہ ہے)

نبات — نباتات (نباتات میں دوسری ت جمع کی ہے اور تائے جمع مؤنث پر دو زبر نہیں آتے)۔

کچھ اور بھی ہیں جو قلیل الاستعمال ہیں اور ان میں کچھ وضاحت بھی ضروری ہے۔

البتہ — آخر میں تائے زائدہ ہے جو وقف کی وجہ سے مبدل بہائے ہوز ہو گئی ہے اور الف لام کی وجہ سے اس پر تنوین نہیں آسکتی۔

بغتۃً، شماتۃً، نکتۃً۔ ان میں دوسری تائے زائدہ ہے نکات میں تائے مادہ ہے۔ قنوتاً، قانتاً میں بھی تائے مادہ ہے۔ یاد رہے کہ تائے اصلی (تائے مادہ) کبھی مدور نہیں لکھی جاتی۔

تائے اصلی والے مذکورہ بالا الفاظ پر نظر ڈالیے۔ وقتاً فوقتاً کے علاوہ کتنے لفظ ہیں جو اردو میں تنوین نصبی کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں؟ گنتی کے دو تین لفظوں کے لئے سارے نظام کو درہم برہم کیا جا رہا ہے؟

مفاعلہ اور فاعلہ کے وزن پر اردو میں بہت سے الفاظ رائج ہیں۔ سب میں تائے زائدہ ہوتی ہے۔ جیسے معاملہ، محاکمہ، مقابلہ، ضابطہ، قاعدہ، حادثہ، واقعہ۔
اگر کوئی شخص مقابلۃ اور واقعۃ کو باضافۂ الف لکھے تو آپ اس کو بتایئے اور اگر لحاظ اور ادب یا کسی قسم کی مرعوبیت کی وجہ سے لب کشائی نہ کر سکیں تو اپنے دل میں اس کو غلط سمجھیے۔

ہمزہ پر تنوین ص۱۱۴

فرماتے ہیں:- اس میں بھی ایک طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہ ہر صورت میں ہمزہ پر دو زبر لگائے جائیں اور جس طرح ابتداءً لکھا جاتا ہے اسی طرح شےءً لکھا جائے۔ قاعدہ یہ ہوا کہ جن لفظوں کے آخر میں اصلاً ہمزہ ہے اور اب وہ ہمزہ کے بغیر مستعمل ہیں تنوین کی صورت میں ایسے لفظوں کو اصل کے مطابق مع ہمزہ لکھا جائے گا اور اس ہمزہ پر دو زبر لگائے جائیں گے۔ جیسے ابتداءً، جزاءً، انتہاءً، جزءً، شےءً۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ اس طرح کے لفظ چند ہی ہیں اور وہ بھی عام طور پر استعمال میں نہیں آتے۔ اس لئے ان لفظوں کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔
چند ہی لفظوں کی وجہ سے آپ خود کیوں پریشان ہو گئے کہ متعارف املا کو بدلنے لگے۔ پہلے کا طریقۂ املا بالکل سیدھا سا ہے۔ جن الفاظ میں الف کے بعد ہمزہ ہے ان میں ہمزہ پر دو زبر لگائے جاتے ہیں۔ جیسے احیاءً، ادعاءً، التجاءً۔ اور جن میں الف نہیں ہے اور مادّہ مہموز اللام ہے ان میں الف لکھا جاتا ہے۔ جیسے جزواً، شیئاً، بریئاً، قارئاً، مبدئاً۔ اس قدیم اور متعارف قاعدے میں کیا پریشانی ہے؟

تائے دراز ص۱۱۸

فاضل مصنف تحریر فرماتے ہیں:- عربی میں ت کی دو صورتیں ہیں۔ تائے دراز (ت) اور تائے مدور یا تائے موقوفہ (ۃ)۔ عربی میں ان دونوں میں فرق کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ لفظ کے آخر میں اگر

(ت) ہو اس صورت میں تنوین (دو زبر) کے لئے (ت) کے بعد
الف کا اضافہ کیا جائے گا۔ جیسے وقتاً، جناتاً۔ الخ

لفظ جناتاً پر فاضل مصنف نے غور نہیں فرمایا۔ اس (ت) پر دو زبر نہیں آتے
میں پہلے لکھ چکا ہوں۔

آگے لکھتے ہیں کہ "انجمن کی اصلاح رسم خط کمیٹی نے یہ تجویز کیا تھا۔
کہ اردو میں ہمیشہ ت لکھنا چاہیے" یہ فیصلہ نہایت مناسب تھا۔
اس لئے کہ اُردو حروف تہجی میں تائے موقوفہ یا تائے مدور نام کی
کوئی چیز نہیں۔ اور اس کی مطلق ضرورت نہیں کہ ضرورت کے
بغیر اس فہرست میں ایک صورت کا اضافہ کیا جائے۔

حروف ہجا میں اضافہ کی ضرورت نہیں۔ آپ یہ کہیے کہ ایک تلفظ کئی مختلف شکلوں
میں لکھا جاتا ہے۔ مثلاً ت، ۃ۔ س، ص۔ ھ، ہ، ہر، ہر۔ وغیرہ

کاتب صاحب توجہ فرمائیں۔ صفحہ ۱۱۸ و ۱۱۹ پر مندرجہ ذیل الفاظ کے شوشے
غلط ہیں:۔

اکثر، پیروی، بغیر، نسبتۃً، حقیقۃً، روءمۃ، امۃ، کبرا، متروک۔ صلہ[۱۲۱]
پر تین جگہ رحمۃ للعالمین آیا ہے۔ اور تینوں جگہ غلط لکھا ہے۔ یاد رکھیے اس مرکب میں
رحمۃ کے بعد الف نہیں ہے۔ یہ اصلاح املا کی کتاب ہے اس لئے توجہ دلا رہا ہوں،
برا نہ مانیے گا۔

حکم دیا جا رہا ہے کہ ۃ اگر تائے ملفوظہ ہو تو لمبی لکھی جائے۔ کس قدر حسین و
جمیل کلیہ ہاتھ لگا ہے۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا ذوق و غالب کو آواز دینا

اصلاح شدہ املا یہ ہوگا۔ کعبت اللہ، قبلت المسلمین، مدرست العلوم،
صدقت الفطر، اسوت الرسول، سیرت النبی۔ حکمت الانصاف، مکتبت الجامعہ،
صلات الفجر، زکات حسن، مشکات المصابیح، طرفت العین، اُمت الرسول، امت
محمدیہ، حظیرت القدس، خدیجت الکبرا، فاطمت الزہرا، مقدمت الجیش۔ مقدمت
الکتاب، کلمت اللہ، سلسلت الذہب، روضت الرسول، علامت الدہر، تحفت

الاحرار، رحمت للعالمین، رحمت الکبرا، برطانیت العظما، مدنیت النبی، بجدت السہو، عامت الناس، عامت الخلائق، طلبت العلم، مقبرت السلاطین، تذکرت الشعرا، سدرت المنتہا، منطقت البروج، ملائکت العرش، مکت المکرمہ، ملائکت المقربین وغیرہ

اُفوہ! پھر استثنا نکل آیا ۔ ارشاد ہوتا ہے کہ لفظ رحمت کو رحمت للعالمین اور رحمت اللہ میں تو لمبی ت سے لکھو اور رحمۃ اللہ علیہ میں تائے مدورسے لکھو صفحہ ۵۹ پر فاضل مصنف نے مشورہ دیا تھا کہ حتی الامکان، حتی المقدور جیسے مرکبات سے پرہیز کیا جائے ۔ ان کی جگہ امکان بھر، مقدور بھر جیسے الفاظ آسکتے ہیں ۔ اب یہاں صفحہ ۱۲۲ پر پھر ویسا ہی ارشاد ہوا ہے : ۔

"زیادہ مناسب تو یہ ہوگا کہ اس طرح کے مرکبات امکان بھر استعمال نہ کیے جائیں ۔ ان کے بغیر بھی آسانی سے بات کو کہا جاسکتا ہے "

بیشک یہ مشورہ بھارت کے رہنے والوں کے لئے قابل قدر اور واجب العمل ہے ۔ اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچنا چاہیے ۔ مگر اس کی مندرجہ بالا عبارت ذرا مشکل ہو گئی ہے ۔ اگر یوں تحریر فرماتے تو اردو کے معلیٰ کے اوپر مزید احسان ہوتا ۔

ادھک اُچت تو یہ ہوگا کہ اس پرکار کے مشرت شبد سکت بھر پریوگ نہ کیے جائیں ۔ ان کے بنا بھی سرلتا سے بات کو کہا جاسکتا ہے ۔

چار کلیے ہاتھ آئے گویا ایک لفظ کے لئے چار نرالے ہیں تیار ہو گئیں ۔ مفرد ہو تو کعبہ، مکہ، مدینہ، صدقہ، تحفہ، روضہ ۔ الف کے قافیے میں آئے تو کعبا، مکا، مدینا، صدقا، تحفا، روضا ۔ ترکیب میں آئے تو کعبت ۔ مکت، مدنیت، صدقت، تحفت، روضت ۔ تنوین نصبی آئے تو تحفتاً، دفعتاً وغیرہ ۔

ابتری صفحہ ۱۲۵

فاضل مصنف لکھتے ہیں : ۔ کچھ لفظ ایسے ہیں جو ت اور ط دونوں سے لکھے جاتے ہیں ۔ ان کی صرف ایک لکھاوٹ کو اختیار کرنا چاہیے اور ایسے سب لفظوں کو ت سے لکھنا چاہیے ۔ اس میں سادگی بھی ہے اور آسانی بھی ۔ (مثال طشت اور طباشیر)

آگے لکھتے ہیں:۔ مگر عدم تعین کے پھیلائے ہوئے اس انتشار کا کیا علاج کہ ان لغات خاص طور پر آصفیہ میں بیشتر لفظات اور طا دونوں حرفوں کی فصلوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ اور عبارت میں بھی یہ لفظ کہیں ت سے لکھے گئے ہیں کہیں ط سے۔ جب لغت کا یہ حال ہے تو عام کتابوں میں اور تحریر میں اگر اس سے زیادہ ابتری ہو تو اس پر تعجب کیوں ہو؟

لغات کا تنوع نہ صرف اردو میں بلکہ اور زبانوں میں بھی ہوتا ہے۔ اردو میں ٹھیرنا اور ٹھہرنا دونوں لغت ہیں۔ اور دونوں صحیح ہیں پہنچنا اور پہونچنا دونوں طرح لکھا جاتا ہے اور دونوں املا صحیح ہیں۔ املا کے تنوع سے آپ کیوں گھبراتے ہیں؟ کیا پریشانی اور کیا دشواری ہے؟ الفاظ کی اصل اور ماخذ کو بھلا دینے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔

آنو یانو وغیرہ ص ۱۴۲

فاضل مصنف نے مندرجہ ذیل آٹھ لفظوں کے بارے میں اختلاف املا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا اب ایک ہی املا اختیار کرنا چاہیئے۔ یعنی نون غنہ واؤ پر مقدم رہنا چاہیے اور یہی املا مرزا غالب نے پانو میں اختیار کیا ہے۔ بات بالکل ٹھیک اور واقعی ان الفاظ کا املا یہی صحیح ہے۔ لیکن کیا کیا جائے؟ عام روش کو بدلنا بھی مشکل ہے۔ میں خود پاؤں چھاؤں گاؤں کھڑاؤں لکھنے کا عادی ہوں۔ اب انشاء اللہ اس عادت کو بدلنے کی کوشش کرونگا۔ کتابت میں نون غنہ کے مقام کی تعیین واقعی دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ املا میں اختلاف نظر آتا ہے۔ جیسا جس کی سمجھ میں آیا ویسا لکھ دیا۔

وہ آٹھ الفاظ یہ ہیں:۔ آنو پانو چھانو دانو ٹھانو گانو نانو کھڑانو

بہر حال مرزا غالب ہی کا اختیار کیا ہوا املا صحیح ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ نون غنہ الف کی آواز کے ساتھ شامل ہے اور واو موقوف ہے اسی وجہ سے بعض الفاظ کا تلفظ میم سے ہے۔ مثلاً گانو کا دوسرا تلفظ گام ہے (جیا ٹگام نواگام بیگام) کھڑانو کا دوسرا تلفظ کھڑام۔ نانو کا دوسرا تلفظ نام۔

یہ نون غنہ ہی ہے جو واؤ سے پہلے آکر واؤ کو میم سے بدل دیتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو واؤ کا اپنا تلفظ ہے۔ جیسے جاؤ، ناؤ، داؤ۔ واضح ہو کہ داؤ میں نون غنہ قطعاً نہیں ہے اور تلفظ دہلی میں تو بغیر نون غنہ کے ہے۔ یہ فارسی لفظ ہے۔ اصل کے مطابق رہنا بھی چاہیے۔

کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ اصل میں میم تھا۔ نون اور واؤ سے بدل کر آنو بن گیا۔ اس کی اصل اَدُم ہے۔ جس کے معنی فساد اور بگاڑ کے ہیں۔ اُردو میں اَم جانا بولا جاتا ہے (ماؤف ہو جانا)۔

دبستانی چشمک ص۲۴۵

فرماتے ہیں:۔ "رہی دہلی و لکھنؤ کے اختلاف کی بات، سو اب نہ وہ دہلی ہے نہ وہ لکھنؤ، اب نہ وہ دبستانی چشمک ہے اور نہ وہ جذبۂ رشک و رقابت یا جذبۂ مسابقت، رات گئی بات گئی۔"

بالکل بجا فرمایا۔ میں بھی تائید کرتا ہوں۔ جوانی کی راتیں گئیں، مرادوں کے دن آگئے:۔

لوگ کہتے ہیں بنا دہلی بگڑ کر لکھنؤ پر کہاں ہے آداغ اس اُجڑے ہوئے گھر کا جواب

طوطا

کسی ادیب کا ایک مقولہ کہیں نظر سے گذرا تھا "استاد کا حکم سر آنکھوں پر" مگر طوطا کو طوئے سے لکھنے میں جو مزہ ہے وہ تے سے لکھنے میں نہیں ہے"۔ قائل نے محض اپنی ایک وجدانی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔ جو دلیل و حجت سے بے نیاز ہے۔ لیکن بات ہے ٹھیک۔ مدلول کا صحیح تصور صرف طوئے سے لکھنے میں آتا ہے اور تے سے لکھنے میں ایک منی سی چڑیا نظر آتی ہے۔

آپ کو معلوم ہے؟ کہ حروف ہجا کی شکلیں تجویز کرتے وقت آواز نکالنے کی ہیئت اور بعض زبانوں میں فطرت کی موجودات کی ہیئت وصورت کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً چینی رسم الخط کو دیکھیے۔ پہاڑوں درختوں وغیرہ کی شکلیں حروف کی اشکال میں پائی جاتی ہیں۔

مانا کہ طوئے فارسی میں نہیں ہے۔ لیکن طمانچہ، طنبورہ وغیرہ ہندوستان

ہیں کہاں سے آئے؟ اور اب ان کا املا بدلنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟ کیا ایران کی تقلید ہمارے اوپر فرض ہے کہ جو کچھ وہ کرتے رہیں ہم بھی وہی کرتے رہیں سلیمان حییم نے طوسے کے کتنے بغیر عربی الفاظ لکھے ہیں۔؟

دیکھیے ایک بیماری کا نام ذیابطیس اور ایک کا لیتر غس ہے۔ ایک آدمی کا نام ارسطو ہے۔ کیا آپ فرمائیں گے کہ چونکہ یہ یونانی الفاظ ہیں اور یونانی زبان میں ذ ث ط نہیں ہے لہذا ان الفاظ میں سے تینوں حرفوں کو خارج کر دینا چاہیے۔ کیا واقعی انگریزی اور یونانی میں ان حروف کا تلفظ موجود نہیں؟

ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ ہمیں پورا حق حاصل ہے کہ ہم اردو فارسی الفاظ پر الف لام بھی لگا سکتے ہیں (قریب المرگ، فوق البھڑک) اردو سے فارسی اور عربی کے قاعدے کے مطابق مصدر بھی بنا سکتے ہیں (رہائش، گرمائش، نزاکت) اردو سے عربی کے اسم مفعول، اسم فاعل اور مبالغہ کے صیغے بھی بنا سکتے ہیں مجرب، خراج، سمجھ دار) دوسرے ہی سانس میں کہا جاتا ہے کہ طوطا کو ت سے لکھو، کیونکہ طوے اردو میں نہیں ہے۔ کیا اردو میں لام تعریف ہے؟

تراوڑ ص۱۳۲

فرماتے ہیں:۔۔۔ عربی کا لفظ طراوت عام طور پر مستعمل ہے اور مستعمل رہنا چاہیے۔ کہنے کی بات بس یہ ہے کہ اسکی مہند صورت تراوت ہے اور مقصد یہ ہے کہ اس لفظ کو غلط نہ کہا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس اردو لفظ تراوت کی ایک عوامی صورت تراوٹ بھی ہے۔ یہ ابھی بول چال کی حد تک محدود ہے۔ بہ ہر صورت یہ بھی ایک لفظ ہے۔

واصف عرض کرتا ہے کہ تراوٹ عربی لفظ طراوت کا مہند نہیں ہے۔ بلکہ لفظ تر سے بنایا گیا ہے جیسے گول سے گلاوٹ، رہنا سے رہاست، بسنا سے بساست، لکھنا سے لکھاوٹ وغیرہ اور تراوت کوئی لفظ نہیں۔

یہ تلون مزاجی بھی قابل داد ہے کہ اسی باب کے شروع میں تلفظ یا املا کے تنوع کو آپ ابتری سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور باب کے آخر میں تراوٹ کے متعلق بڑی فراخ دلی سے فرماتے ہیں ۔۔۔"بہر صورت یہ بھی ایک لفظ ہے"۔

آپ جس کو ابتری سمجھتے ہیں یہ تو دوسری زبانوں میں بھی ہے۔ آذوقہ اور راسا جیسے بہت سے الفاظ کو حلیم نے ذال اور زے دونوں میں لکھا ہے۔ اور انگریزی کا تو کہنا ہی کیا ہے! مگر ساری دنیا پر اس کی حکم رانی ہے۔ رات رات بھر اس کے اسپیلنگ رٹے جاتے ہیں اور کوئی اُف نہیں کرتا۔

چند روز ہوئے بازار میں دیوار پر ایک لاؤڈ اسپیکر والے کا اشتہار دیکھا تھا۔ اس میں ایک جملہ یہ بھی تھا "یہاں فٹنگ کا بھی ماقول انتظام ہے"۔ کسی نامعقول قدامت پسند نے اشتہار دیکھا ہوگا۔ لفظ ماقول کو غلط سمجھ کر قلم زد کر دیا اور نیچے لکھ دیا، مقعول۔ لیجیے لغت میں درج کرنے کے لئے تین نئے لغت ہاتھ لگے۔

(م اق و ل) (ان ٹ ظ ام) (م ق ع و ل)

ایک دکاندار خاصے معزز بھاری بھرکم آدمی ہیں۔ ایک روز افسوس و شکایت کے لہجے میں کہنے لگے ۔" یہ لوگ اردو کو ختم کیے دیتے ہیں۔ ہمارا تو سارا (اَن ٹی چَ ژم) اردو میں ہے۔ ذرا سی زحمت تو ہوگی۔ شہر میں چل پھر کر اردو لغت کے لیے بڑا قابل قدر ذخیرہ فراہم کیا جا سکتا ہے۔

ذی ہوش، بذلہ ص۱۳۵ و ۱۴۰

لفظ ذی فارسی یا اردو الفاظ میں چسپاں نہیں ہوتا۔ ہوش فارسی لفظ ہے۔ ذی ہوش کی ترکیب غلط ہے۔

بذلہ۔ عربی میں غیر سنجیدہ گھٹیا اور عوامی کلام کو کہتے ہیں۔ اردو میں اسی معنی میں مبتذل کا لفظ ہے۔ دونوں لفظوں کا مادہ ایک ہی ہے۔ اسی مناسبت سے سلیمان حلیم نے بذلہ کے مندرجۂ ذیل معانی بھی لکھے ہیں۔ مسخرہ پن، فقرے بازی، ٹھٹھول، مذاق، دل لگی، طعنہ، رمز، چوٹ، ہنسی، پھبتی۔ مگر اردو میں بذلہ گوئی و بذلہ سنجی اچھے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

واوِ معدولہ اور ذال کا وجود ص۱۴۲

میں آپ کی رائے سے بالکل متفق ہوں کہ" ذال کا وجود فارسی میں پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے"۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ذال کے علاوہ صاد کا بھی تلفظ موجود تھا لیکن حروف کی شکلیں خود تجویز نہیں کیں، عربی سے لے لیں۔ اور ایک تلفظ اور

بھی ہے۔ وہ ہے خ واؤ کا مخلوط تلفظ۔ اس کی بھی کوئی الگ شکل تجویز نہیں کی۔ خ کے ساتھ واؤ کو لگا دیا۔ اردو میں جسکو واؤ معدولہ کہتے ہیں یہ وہی واؤ ہے۔ یہ دراصل غیر ملفوظ نہیں ہے۔ ہم اردو والے کما حقہ اس کا تلفظ نہیں کر سکتے۔ ہم نے واؤ معدولہ نام رکھ کر اس کو معدوم کر دیا۔

کہیں کہیں یہ واؤ واضح طور پر تلفظ میں آجاتا ہے۔ خوبچہ، خوجہ، آبخورہ، کہیں کہیں اس کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ جیسے درخواست، خواجہ، دسترخوان، اُردو میں بھی درخواست اور خواجہ کا تلفظ برخاست اور راجہ سے مختلف ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ دسترخوان کا تلفظ خان بہادر سے مختلف ہے۔ لفظ خویش میں ضمہ و کسرہ ملا جلا معلوم ہوتا ہے۔ اگر "خ" کو مونھ گول کر کے ادا کریں تو خویش اور خیز کے تلفظ میں فرق محسوس ہوگا۔

میں نے بزمانہ طالب علمی جب گلستاں میں سعدیؒ کا قطعہ پڑھا:-

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب　　گبر و ترسا وظیفہ خور داری

دوستاں را کجا کنی محروم　　تو کہ با دشمناں نظر داری

استاد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ خور کی خے کو زبر سے پڑھو۔ آگے نظر کا قافیہ ہے۔ فرمایا کہ خوردن میں دراصل خ مفتوح ہے۔ مگر اس کا تلفظ ایسا ہے کہ زبر کا پیش کی طرف جھکاؤ ہوتا ہے۔ یعنی خ کو موتھ گول کر کے نکالا جاتا ہے۔ فرمایا کہ خورانیدن اور خراشیدن دونوں کی خے کے تلفظ میں فرق ہے۔ اس فرق کی وجہ سے واو کا اضافہ کیا گیا۔

استاد رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ فرمایا پہلے ایسا ہی تھا۔ آجکل کے ایرانیوں نے سرے سے الف کو ہی اُڑا دیا۔ خانہ کو خونہ کہتے ہیں۔ عصر حاضر کے ایرانیوں کا لہجہ وہی ہے جسکو پہلے کے لوگ مغل کہہ کر مذاق اُڑایا کرتے تھے۔

اُردو میں بھی چند ایسے تلفظ ہیں جن کے لئے ہم نے کوئی شکل تجویز کر کے حروف ہجا میں اضافہ نہیں کیا۔ جیسے ہائے مخلوط۔ وھ، کھ وغیرہ۔ اور یائے مخلوط جیسے کیا، کیوں، اکیاون، اکیاسی، پچیاسی، اکیانوے۔ پچیانوے، چھیانوے، بیاہ، پیار وغیرہ

ذلالت ص۱۴۹

فاضل مصنف لکھتے ہیں :۔ "یا تو ذلالت کے قیاس پر یا ایک دوسرے لفظ ضلالت (گمراہی) سے دھوکا کھا کر ذلالت (کمینہ پن) ایک نیا لفظ بنا لیا گیا ہے۔ یہ لفظ ابھی تک چند لوگوں کی بول چال تک محدود ہے۔ نیا لفظ بنانے میں کچھ ہرج نہیں خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ ضلالت سے اس کو ممیز رہنا چاہیے۔"

واضح ہو کہ یہ نیا اور مصنوعی لفظ نہیں ہے۔ اقرب الموارد میں موجود ہے۔ ذُلٌّ، ذَلالَۃٌ، مَذَلَّۃٌ، ذِلَّۃٌ۔ معنی بے عزت، اور حقیر ہونا۔ لیکن کمینہ پن کے معنی میں عامیانہ اور غیر فصیح ہے۔ لوگ رذالت کی جگہ ذلالت کہہ دیتے ہیں۔ رذالت، کمینہ پن کے معنی میں بفتح اول ہے۔ اردو میں بکسر اول غلط العام ہے۔ رذالہ کے معنی ہیں کمینہ۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ارادت، ارادہ۔ عقیدت، عقیدہ۔ رسالت، رسالہ۔ یاد رہے کہ رذالہ کو الف سے لکھنا غلط ہے۔ اور رُذالہ بضم اول اس معنی میں نہیں ہے۔

س کی کشش ص۱۶۴

فاضل مصنف لغت اور املا کے باب میں گلفشانی کرتے کرتے فن خطاطی کی بھی چمن بندی فرمانے لگے۔ لکھتے ہیں :۔

"س کے بعد جب ایک یا ایک سے زیادہ حرف آئیں جن کو شوشے سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اچھا یہ ہوگا کہ دندانے دار س کے بجائے کشش دار س بنایا جائے۔ اس طرح شوشوں کا ہجوم بھی نہیں ہوگا اور غلط نویسی کا امکان بھی کم ہو جائیگا جیسے یاسین، سخنا۔ خاص کر جب دو س یا ش ایک ساتھ آئیں۔ یا ایک دو حرف کے فصل سے آئیں تب کشش دار ش یا س لکھنا مناسب ہوگا کشمش، کشمکش، کشمش۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک جگہ دندانے دار صورت بنائی جائے اور ایک جگہ کشش دار جیسے شمس

ایک بات اور ـــ جب کسی لفظ کے متصل جز میں شں اور
س یک جا ہوں اس صورت میں اچھا یہ ہوگا کہ شں کی کشش
دار لکھا جائے اور سں کو دندانے دار۔ اس سے امتیاز کا رنگ زیادہ
نمایاں رہے گا ۔ جیسے شمسی ۔ ہاں لفظ کے منفصل اجزا میں اگر یہ
یک جا ہوں اس صورت میں دونوں کو کشش دار لکھنا کچھ بے جا
نہوگا ۔ جیسے شارستان ۔ سں یا شں یا س یا ش میں کچھ فرق
نہیں ۔ دونوں صورتیں یکساں ہیں ۔ کون سی صورت، کہاں پر اختیار
کی جائے اس کا تعلق اصل میں تو اس سے ہے کہ لکھنے میں جلدی،
پڑھنے میں آسانی اور ان دونوں کے بعد یہ کہ خوش نمائی کا تقاضا کیا
ہے ۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے میرے خط کے جواب میں
لکھا تھا :ـــ

س اور ش ایک ہی چیز ہے ۔ دونوں پر تین نقطے لگا دیجیے
تو دونوں ش ہیں ۔ شکل س یوں وجود میں آئی کہ منشیوں کو جلدی
لکھنا پڑتا تھا ۔ اور دندانے میں انگلیوں کو روکنا ضروری ، اس
لئے س میں وقت بھی بچا اور ہاتھ زحمت سے بچا ۔ ٹائپ میں
یہ جھگڑا نہ رہا ۔

واصف عرض کرتا ہے کہ چشم تصور وا ہو تو دیکھو میر علی تبریزی بیٹھا ہوا اپنا
سر دھن رہا ہے ۔ میر پنجہ کش اور منشی اعجاز رقم دونوں حیرت میں ہیں ۔
واضح ہو کہ سین کی کشش نسخ میں نہیں ہے ۔ البتہ زائد (بلا حرف) کشش
ہے ۔ جیسے ۔ فیــہ ۔ جب اس کو چھیل چھال کر نستعلیق بنایا تو سین کی کشش خود
ایجاد کی گئی اور عربی سے کشش زائد کو بھی لے لیا گیا ۔ فن خطاطی کے اساتذہ سین کی
کشش یا کشش زائد کی اجازت اس وقت تک نہیں دیتے جب تک کوئی اشد ضرورت
پیش نہ آئے ۔ مثلاً دو سین ایک جگہ جمع ہوں جیسے کشش، کوشش میں ۔ یا سطر کے
آخر میں اتنی تھوڑی سی جگہ خالی رہ جائے کہ اگلا لفظ نہ آسکے ۔
خیال رہے کہ دو سین اگر یکجا ہوں تو چھوٹے جگہ کی کمی کی صورت میں گوارا

کر لیے جائیں گے لیکن یکجا دو کششوں کی اجازت اساتذۂ فن ہرگز نہیں دیتے کششوں کی زیادتی کو قابلِ نفرت اور مکروہ عادت قرار دیا گیا ہے ۔ فاضل مصنف نے جو یکجا دو کششوں کے نمونے دیئے ہیں سب غلط ہیں ۔ اور مندرجۂ ذیل الفاظ میں تو ایک بھی کشش کی ضرورت نہیں ہے ۔ شمس ، کشمش ، کشمکش ، یاسین ، سُننا ۔

شوشوں کے بارے میں جو گلہ شکوہ ہے ، اردو املا کو سب سے بڑا سانحہ یہی پیش آیا ہے ۔ اسی کتاب میں جس کا موضوع ہی اصلاح املا ہے شوشوں کی بہت غلطیاں ہیں ۔ حالانکہ خط اچھا اور دیدہ زیب ہے ۔

زنبور ص ۱۸۱

اگر کسی لفظ میں نون ساکن کے بعد ب ہو تو نون کی آواز میم کی آواز سے بدل جاتی ہے یعنی لکھا تو جاتا ہے نون مگر پڑھا جاتا ہے میم ۔ جیسے منبر ، جنبش ، گنبد ۔ اس پہ بحث کرتے ہوئے فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ یہ قاعدہ عربی اور فارسی سے مخصوص ہے اور ہندی اردو الفاظ میں فارسیت کی وجہ سے غلط رواج پا گیا ہے ۔ لہٰذا عربی فارسی الفاظ کو تو عربی فارسی قاعدے کے مطابق لکھنا چاہیے جیسے انبار ، انبساط وغیرہ ۔ اور ہندی اردو الفاظ کو تلفظ کے مطابق میم سے لکھنا چاہیے جیسے امبالہ ، اچمبھا ، سمبھل ، وغیرہ

واضح ہو کہ عربی الفاظ میں آواز کی یہ تبدیلی عارضی ہوتی ہے ۔ جب ن ب کے بیچ میں کوئی حرف آجاتا ہے تو نون اپنی آواز دیتا ہے ۔ یعنی اس عارضی تلفظ کی وجہ سے لفظ کے حروف اصلیہ میں کوئی تصرف نہیں ہوتا ۔ وہ کتابت میں قائم رہتے ہیں ۔ مثلاً زنبور کی جمع زنابیر میں نون کی آواز واپس آگئی ۔ زنبیل کی جمع زنابیل ۔ سنبل کی جمع سنابل ۔ منبر کی جمع منابر ۔ انبیا کا مفرد نبی ۔ منبع کی اصل نبع ، جمع منابع ۔ اگر اس عارضی تلفظ کی وجہ سے املا میں بھی نون کی جگہ میم لکھا جائے تو اصل مادّہ یا ماخذ مسخ ہو جائے گا اور یہ درست نہیں ۔ پس اردو میں بھی ایسے الفاظ کی پہلے اصل معلوم کی جائے ۔ اگر اصل مادّہ میں نون ہے تو املا میں اس کو قائم رکھا جائے ۔ اس عارضی تلفظ کی وجہ سے اصل کو مسخ نہ کیا جائے ۔

فاضل مصنف نے اردو الفاظ کی جو فہرست دی ہے ان میں بعض الفاظ تو

خواہ مخواہ بلا ضرورت شامل کر دیئے ہیں - جیسے امبیدکر، امبیسی، امبولنس، بمبو، بمبئی، ٹمبر، دسمبر، ستمبر، جمبو، رمبھا، زامبیا، شمبھو، ڈگمبر، سمبت، سمپٹ، کمبل، کمبوڈیا، کمبوہ، کھمبات، کمپو، کمپنی، کمپوزنگ، کمپاس، ممباسا، ممبر، نمبر، نمبوتری پد، بمبوق، کھمبق، یہ الفاظ عام طور پر میم سے لکھے جاتے ہیں۔

زنبور، عربی لفظ ہے، اردو میں وہیں سے آیا ہے۔ اصطلاحاً ایک آوزار کو کہتے ہیں۔ املا بدلنے کی ضرورت نہیں۔ یعنی نون ہی سے لکھا جائے گا۔

چنبک، ٹھیٹھ فارسی لفظ ہے - اردو میں اس کا مترادف چمک (بضمہ اوّل و میم مشدد) بولا جاتا ہے۔ اس کو یا تو چنبک کا مورد سمجھا جائے یا چومنا سے مشتق قرار دیا جائے بہر حال ایک مستقل اور فصیح لفظ ہے۔ آصفیہ میں اسکو ہندوؤں سے مخصوص بتایا ہے لیکن اب تو سب اردو والے بولتے ہیں۔ لفظ چنبک کو میم سے لکھنے کی ضرورت نہیں۔

اب رہے اردو الفاظ تو اُن میں سے بعض تو مجھے معلوم نہیں کیا ہیں ؟ جیسے جمبو، کھمبق، بمبوق وغیرہ۔ بعض کی کچھ نامکمل سی تحقیق مندرجۂ ذیل ہے :-

چنپت ــ یہ مرکب ہے چنچ + پتھ ۔ سنسکرت میں چنچ کے معنی ہیں چلنا ۔ پتھ کے معنی راستہ ۔ معنی ہوئے راستہ چلنا یا راہ لینا ۔ اسی سے چنچل بنا ہے یعنی جو ہر وقت چلتا رہے ٹھہرے نہیں۔ متحرک اور بیقرار۔ نون اس میں حروف اصلیہ میں سے ہے۔ سنسکرت اور ہندی میں اس کا املا نون سے ہے ۔ میم کا تلفظ پ کی وجہ سے عارضی ہے ۔ چنچل میں نون کا تلفظ ہے ۔ اس عارضی تلفظ کی وجہ سے املا تبدیل نہیں کیا جائیگا۔ چن پتھ اور رجن پنتھ ایک ہی جیسے دو لفظ ہیں۔

سنپورن ــ سنسکرت میں سن کے معنی ہیں۔ حاصل کرنا، لینا، وصول کرنا، قبضہ لینا، فائدہ حاصل کرنا، بخشنا، دینا، تقسیم کرنا، کامیاب ہونا، منظور کیا جانا۔ وغیرہ ـــ پورن کے معنی مکمل ۔ یعنی پورا کامیاب، مظفر و منصور۔

اچنبھا ــ اس کا املا، پالی، گجراتی، مراٹھی، ہندی، ان سب زبانوں میں نون کے ساتھ ہے۔

کھنبا ــ اس کی اصل غالباً تھنب ہے ۔ تھ کھ کا تبادلہ ہوا ہے ۔ تھنب کے

معنی مددگار اور سہارا دینے والا۔ اس کا املا سنسکرت اور پراکرت میں نون کے ساتھ ہے۔ تھامنا کو پہلے تھانبنا لکھا جاتا تھا۔ وہ اسی سے ماخوذ ہے۔

تنبو — تاننا سے بنا ہے۔ میرے خیال میں یہ پہلے تنبھو تھا۔ بھو کے معنی ہیں زمین، جگہ، مقام۔ زمین پر خیمہ تانا جاتا ہے۔ اس میں نون جزو لفظ ہے۔

چنبل — پنجاب کا ایک دریا۔ ہندی میں اس کا املا بھی نون کے ساتھ ہے۔

سنبھلنا۔ سَن اور بھل سے مرکب معلوم ہوتا ہے۔ یعنی طاقت حاصل کرنا۔ سنبھل شہر کا نام ہے اسی سے مشتق معلوم ہوتا ہے اور ہندی میں نون سے لکھا جاتا ہے۔

مانک ہندی کوش (رام چندر ورما پریاگ) اے سنسکرت انگلش ڈکشنری (سر مونیئر، مونیئر ولیم) اور کچھ اپنی قیاس آرائی۔

فارسی میں ایک لفظ ہے تنبان جس کے معنی صدری یا برجس کے ہیں۔ یہ ن ب سے لکھا جاتا ہے اور میم کا تلفظ ہوتا ہے۔ یہ مرکب ہے تن اور بان سے یعنی جسم کا محافظ اگر اس کو م سے تمبان لکھا جائے تو وضع لفظی مسخ ہو جائیگی۔

نون اور ب کے اجتماع سے میم کی آواز کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ اور عربی اور فارسی کے علاوہ سنسکرت اور ہندوستان کی دوسری قدیم و جدید زبانوں میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اور اسی طرح املا بھی ملتا ہے تو اردو پر ایسی کیا بپتا پڑی ہے کہ نون کو ہڑپ کرنے کے لئے میم کو آگے بڑھا دیا جائے۔ اور بلا وجہ ایک وحشت پیدا کی جائے منبر، سنبل، گنبد، شنبہ وغیرہ کو آپ اردو میں بھی نون کے ساتھ لکھے جانے پر راضی ہیں تو چند ہی الفاظ باقی وہ جاتے ہیں۔ یہ دو رنگی پیدا کر کے بلا وجہ پریشانی میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟

اصول وہی اختیار کیجئے کہ الفاظ کے مادہ اور ماخذ کی تحقیق کیجئے۔ اگر مادہ میں نون موجود ہے تو سمجھیے کہ ن ب کے اجتماع سے جو میم کی آواز پیدا ہوئی ہے۔ وہ عارضی ہے اس کی وجہ سے املا میں تغیر نہیں ہوگا۔

اور اس تحقیق میں صراح و قاموس سے فتویٰ لینے کی ضرورت نہیں، اپنے دیس کی زبان کی ڈکشنریاں جو زیادہ تر انگریزوں نے مرتب کی ہیں ان سے استفادہ کیجیے۔

مونھ صـ ۱۸۴

فرماتے ہیں: — مُنہ اور مُونہ۔ یہ دونوں لفظ کسی اختلاف کے بغیر ایک ہی

طرح لکھے جاتے ہیں۔ ان میں نون غنہ ہائے ساکن سے پہلے لکھا جاتا ہے۔
ان لفظوں میں کسی طرح کا اختلاف یوں بھی جگہ نہ بنا سکا کہ پہلے مُنہ کو
مونہ لکھا جاتا تھا۔ واو ہٹا، مُنہ رہ گیا۔ مِنْہ کی ایک صورت مینْہ بھی ہے۔
ی بیچ سے نکل گئی، مِنْہ رہ گیا۔

واقسف عرض کرتا ہے کہ لفظ مونھ کی چار شکلیں دیکھی گئی ہیں:۔ منھ، منہ
مونہہ، مونھ۔ میں نے چوتھا املا اختیار کیا ہے۔ میرے خیال میں واؤ کا رہنا ضروری ہے۔
کیونکہ اس کا مادّہ "مو" ہے۔ اسی سے مونڈنا، موٹھ، مٹھا، مٹھی بنے ہیں۔ دوسرے یہ کہ
التباس نہیں ہوگا۔ اگر مونھ اور مینہ کو ایک ہی طرح "منہ" لکھا جائے تو اعراب کے بغیر امتیاز
مشکل ہے۔ مونھ کی جمع مونہوں بنے گی۔ جمع میں ہائے ہوز متحرک ہوگی۔ اگرچہ مفرد میں بھی ہائے
مخلوط نہیں ہے مگر ایک التباس سے بچنے کے لئے دوچشمی لکھنا بہتر ہے۔ لڑکیوں کا نام میمونہ
ہوتا ہے اس کو پیار میں مخفف کر کے مونہ کہتے ہیں اس میں ہائے ملفوظ ہی لکھی جائیگی تاکہ اصل
نام سے الگ کوئی نیا لفظ نہ سمجھا جائے۔ آصفیہ میں منہامنہ بھی ہے اور مونہامنہ بھی ہے۔ دیکھو
مقدمہ فرہنگ آصفیہ جلد اول صفحہ کالم ۲

مینہ یا مینھ کا املا "ے" ہی کے ساتھ صحیح ہے۔ بغیر "یے" کے غلط اور لائق ترک ہے۔
صاحبِ آصفیہ نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ دراصل مینہ صحیح ہے۔ اور مِنہ اُسی کا مخفف ہے۔
کیوں؟ مخفف قرار دینے کی کیا ضرورت؟ محض کاتب کی ہم نوائی؟ اگر کاتبوں نے غلط
املا، یا اپنا اجتہادی املا لکھ دیا تو بجائے اصلاح کے آپ نے اُس غلط املا کو لغت قرار
دیدیا۔ کاتب تو بیشمار املا ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اہل لغت اور ماہرین لسان کا فریضہ
کیا ہے؟

کلیاتِ انشا میں مینہ کا املا (ے) کے ساتھ ہے:۔

چاندتارے کے دوپٹے کو شب ماہ سے اوڑھ	مینہ کی بوندوں کے بجاتے ہوئے گھنگرو چھن چھن
منتظر چرخ پہ خود حضرت عیسیٰ آدیں	دید یہ بزم کریں چھوڑ کے مینہ کی چلمن

صاحبِ آصفیہ نے سند میں جتنے اشعار دیے ہیں ان سب میں مونھ کا املا ایک ہی دیا
ہے (مُنہ) حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ غالب، مومن، میر تقی، ظفر، داغ، سودا۔ سب کے دواوین
میں (منھ) داغ کے ہاں ایک جگہ منھ اور ذوق کے ہاں ایک جگہ منہ بھی ہے۔ اسی طرح مینہ

کو منہ لکھا ہے اور سند میں جو غالب کا شعر دیا ہے اس میں مینھ ہے (دیکھو شرح غالب طباطبائی)۔

میندھی صفحہ ۱۸۵

مہندی یا منہدی، امام مہدی کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ مجھے طالب علمی کے زمانے سے یہ املا ہمیشہ کھٹکتا تھا۔ امام کا نام بفتح اول ہے، مگر عوام لفظ امام کے ساتھ بھی بکسر اول یا نون غنہ بولتے ہیں جس طرح ایک مشہور ایڈوکیٹ صاحب مدرسہ کو مندرسہ لکھتے ہیں اسکولوں کے سامنے بیٹھ کر اندرسے کی گولیاں بیچنے والا آواز لگاتا ہے اندرسے کی گولیاں مندرسے میں کھانا۔ تو کیا مندرسے کو بھی لغت میں درج کر دیا جائے؟ امام اور حنا کو گڈ مڈ خود اہلِ لغت ہی نے کر دیا تو عوام کو کیا کہا جائے۔

جب دواوین کے مطالعہ کا اتفاق ہوا تو دیوان ذوق میں اس کا املا میندھی دیکھا۔ مجھے یہی پسند آیا مگر چونکہ نون غنہ بھی تلفظ میں شامل ہے یا اب ہو گیا ہے۔ اس لئے کافی عرصے سے مینڈھی لکھتا ہوں۔

بو نہ گل میندھی کے گلبن رشکِ گل گھملوں میں تو	آ کھڑا ہو رکھ کے میرا کاسۂ سر زیر پا
گل میندھی کیوں نہ باغ میں ہو پائمال رشک	پاؤں میں تیرے دیکھے حنا گر لگی ہوئی
ذوقؔ زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر	وسمہ آب بنگ سے میندھی مے گلرنگ سے

اب بوقت تحریر دیکھا تو فرہنگ آصفیہ میں کئی املا لکھے گئے ہیں مگر دیوان ذوق والا املا اس میں نہیں ہے

گل مہندی — اس کے معنی لکھے ہیں " ایک قسم کے پھول کا نام جو اکثر سرخ اور دکتر اودا معبدو بجبرہ ہوتا ہے" کس قدر ناقص تعریف کی ہے۔ سیدھا سا گل حنا ہی لکھ دیتے۔ اور میندھی کا پھول ہم نے تو کافوری رنگ کا سفید ہی دیکھا ہے۔ یعنی وہ سفید رنگ جس میں ہلکی سی زردی کی جھلک ہو۔ ہندوستان میں مینڈھی کا پھول اور کسی رنگ کا نہیں ہوتا۔ عربی کے اہل لغت بھی اس کو ابیض ہی لکھتے ہیں۔ میندھی گرم خطوں کی پیداوار ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ہندوستان کے علاوہ کہاں کہاں پیدا ہوتی ہے اور اس کا پھول اکثر سرخ اور دکتر اودا کہاں ہوتا ہے؟ ایک جگہ منہدی۔ دوسری جگہ مہندی۔ تیسری جگہ میندھی، اس کے آگے لکھتے ہیں (۱) دیکھو مہندی بمعنی حنا (۲) بالوں کی لٹ، مینڈی۔ یہ دوسرے معنی غلط لکھے ہیں۔ بڑا بھاری سہو ہوا۔ میندھی اور مینڈی کا تلفظ بھی الگ الگ املا بھی اور معنی بھی علیحدہ علیحدہ

بچوں کے یا جن عورتوں کے پیشانی کے اوپر والے بال چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، اور چوٹی میں شامل نہیں ہو سکتے ان کی مینڈیاں گوندھی جاتی ہیں تاکہ بال موتھ پر نہ آئیں۔ یہ لفظ مینڈھ سے بنا ہے۔ میں نے عورتوں کا لفظ اس لئے لکھا ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کا مجسمہ جو دہلی میں ٹاؤن ہال کے سامنے نصب تھا اس میں مینڈیاں گندھی ہوئی صاف نظر آتی تھیں۔

ہندی میں میدھ قربانی کو کہتے ہیں۔ خونِ ذبیحہ کی مشابہت کی وجہ سے شاید حنا کا نام میدھی رکھا گیا ہو۔ بہرحال اس کی اصل یا ماخذ تحقیق طلب ہے۔ لفظ حنا، عربی لفظ ہے بکسر اوّل و نون مشدّد بالف ممدودہ اور آخر میں ہمزہ ہے۔ حِنَّاء۔ اس کو صاحبِ غیاث نے بالف مقصورہ لکھا ہے یہ صحیح نہیں۔

بہنگی، بانہہ ص ۱۸۵

بہنگی، مہنگا، لہنگا، پہنچا، بہنچی۔ سب میں ہائے ہوز نون غنہ پر مقدم ہے۔ صاحب آصفیہ دونوں سے سہو ہو گیا۔ محاورات، روزمرہ اور رسم الخط میں منطق کا دخل نہیں جس طرح شاعری کی دنیا ذرا مختلف ہے اسی طرح رسم الخط کی دنیا بھی ذرا مختلف ہے۔

بانہہ کا املا آپکے نزدیک غلط ہی سہی مگر صحیح اور متعارف یونہیں ہے یعنی دو (ہ) کے ساتھ۔ یہ دراصل کہنی والی ایک لکھی جاتی تھی (بانہ) آگے قلم کی روانی سے ایک (ہ کے) شوشے کا اضافہ ہو گیا۔ جیسے کاف بیانیہ کا صرف ایک چوتھائی دامن لکھنا شروع ہوا (کہ) بائے جارّہ کا صرف ابتدائی سرا بنایا گیا (بہ) تاکہ یہ کسی لفظ ماقبل کا جزنہ سمجھے جائیں۔ رفتہ رفتہ قلم کی روانی سے آگے ذرا سا خم آگیا۔ پھر وہ ہائے مختفی بن گئی۔ قدیم تر مخطوطات میں کہیں کہیں ایسا نظر سے بھی گذرا ہے۔

بانہیں کا قافیہ چاہیں اور آہیں کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسے ہنس اور بھینس کا قافیہ کس کے ساتھ۔ متاخرین ایسے قافیوں کو جائز نہیں رکھتے۔ ہائے ہوز اور نون غنہ اگر یکجا ہوں تو ایک اکثری قاعدہ یاد رکھو۔ اگر ان دونوں سے پہلے حرف علت ہو تو نون غنہ ہائے ہوز پر مقدم ہوگا جیسے بانہہ، مونھ، مینھ، ورنہ ہائے ہوز مقدم ہوگی۔ جیسے مہنگا، لہنگا، بہنچی، پہنچا۔

ماں ص ۱۸۸

مولانا راشد الخیری مرحوم لفظ ماں کو بغیر نون غنہ لکھتے تھے حکیم ناصر نذیر فراق

مرحوم نے ساٹھ کو سات لکھا۔ میں نے دریافت کیا۔ فرمایا ہم تو یونہیں بولتے اور یونہیں لکھتے ہیں۔ دونوں حضرات میرے والد سے بھی عمر میں کچھ بڑے اور پھر دلی والے۔ جائے ادب تھی، خاموش ہونا پڑا، مگر دل نے اس املا کو کبھی قبول نہیں کیا۔

لفظ دونوں میں نون غنہ کیوں نہو جبکہ تینوں، چاروں وغیرہ میں موجود ہے رہا ایک نون کا اضافہ تو وہ اجتماع وادین کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ چھیوں اہلِ دہلی نہیں بولتے۔ اس کی جگہ چھ کے چھ کہتے ہیں۔ پھر ساتوں، آٹھوں پھر نو کے نو۔ دس کے دس۔ گیارہ کے گیارہ۔ سو تک یہی طریقہ رہے گا۔

باٹ ص۱۹۳

دہلی میں آلۂ وزن کے معنی میں لفظ بٹہ (مشدد الاوسط) صحیح اور فصیح ہے۔ باٹ، قرب و جوار کے دیہاتی بولتے ہیں۔ آلات وزن کے معنی میں بٹ اور رہانٹ دونوں متروک ہیں۔ بٹہ کا املا ہمیشہ سے بہائے مختفی ہے اور یہی رہنا چاہیے تاکہ بٹا حسابی اصطلاح سے التباس نہو۔ (ایک بٹا دو وغیرہ)

چھٹنا ص۲۱۰

چھٹنا، چھپنا، اور ایسے ہی بعض اور رلازم و متعدی ہیں جن میں نون غنہ نہ تلفظ میں ہے نہ املا میں۔

گھوٹنا، گھونٹنا ص۲۲۵

لکھتے ہیں :۔ واو معروف و مجہول کا امتیاز تو اب باقی نہیں رہا۔ اس سے قطع نظر کر کے مناسب یہ ہوگا کہ اختلاف معانی کے لحاظ سے دو مستقل مصدر مان لیے جائیں اس طرح۔ گھوٹنا، رگڑنا، حل کرنا وغیرہ۔ گھونٹنا، گلا گھونٹنا۔

عرض ہے کہ اہل دہلی واؤ مجہول و معروف کا امتیاز کرتے ہیں اور آپ کے محاکمہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ گھوٹنا بمعنی رگڑنا، حل کرنا، بواؤ مجہول ہے۔ اور گھونٹنا بمعنی گلا دبانا، بواؤ معروف ہے۔ (اردو مصدر نامہ) اور بقول جناب کے جلال نے یہ امتیاز واضح کیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ دونوں میں نون غنہ بتاتے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں یہ کوتاہی تو سب جگہ ہے کہ نہ ضبط اعراب ہے نہ واؤ مجہول

ومعروف اور یائے مجہول ومعروف کی وضاحت۔

کونپل ص۲۲۹

یہ لفظ فارسی میں یاد نہیں آتا کہ کہیں نظر سے گذرا ہو۔ آصفیہ میں لفظ کلّا کے تحت لکھا ہے " درخت کی وہ کونپل جو کلی کی طرح اول نکلتی ہے اور بعد میں اس میں سے بڑے بڑے پتے نمایاں ہوجاتے ہیں۔ فارسی میں اس کو تندہ کہتے ہیں" غیاث اللغات میں کوپلہ کے معنی شگوفہ لکھے ہیں۔ سلیمان حییم نے کوپلہ کے کئی معنی لکھے ہیں مگر شگوفہ نہیں لکھا۔ آصفیہ نے کونپل کے معانی میں کلی بھی لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ کلی اور چیز ہے کونپل اور چیز ہے۔ فی الحال فارسی الفاظ کی تحقیق کی ضرورت نہیں۔

کونپل کا صحیح املا بواؤ مجہول ونون غنہ ہے۔ یہ دہلی کا لفظ ہے۔ یوپی میں اس کا مترادف لفظ کلّا ہے۔

کینچوا ص۲۳۴

کہتے ہیں کہ "یہ لفظ چونکہ کیچ سے بنا ہے اس لئے اس کا املا کیچوا ماننا چاہیے" یعنی پہلے یہ مانو کہ کیچ سے بنا ہے پھر املا بغیر نون غنہ کے تسلیم کرو۔

بہتر ہوگا کہ کینچلی پر بھی غور کر لیا جائے۔ یہ کاہے سے بنی ہے۔

مونچھ، منجھدھار ص۲۳۵

لغات کے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :— اصلاً یہ لفظ منجھ (بمعنی درمیان) اور دھار سے مرکب ہے۔ (منجھ دھار) کثرت استعمال سے ایک ہائے مخلوط ساقط ہو گئی ہے۔ اب اس کا املا منجدھار ماننا چاہیے"

یہ فیصلہ قابل تسلیم نہیں۔ اول تو مصنف نے یہاں خود اپنے کلیے کی خلاف ورزی کی ہے کہ دو لفظوں کو ملا کر لکھا۔ "منج دھار" لکھنا چاہیے تھا۔ دوسرے یہ کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جلدی کی وجہ سے الفاظ کے حروف دب جاتے ہیں بلکہ بعض تیز بولنے والے تو الفاظ ہی آدھے آدھے بولتے ہیں تو کیا تلفظ کی وجہ سے ہم بیٹھے بیٹھے رسم الخط اور املا کو بدلتے رہیں گے؟

بہر حال صحیح اور مناسب یہ ہے کہ اس مرکب کو الگ الگ لکھنا چاہیے اور ہائے مخلوط دونوں اجزا میں لکھنی چاہیے۔ (منجھ دھار)۔

مونچھ کے املا کے متعلق لغات کے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مصنف اپنا فیصلہ دیتے ہیں :-

سماعت میں یہ لفظ دونوں طرح ہے۔ ترجیح کے لئے اس کا املا نون غنہ کے بغیر مان لینا چاہیے۔ (موچھ) مولفین آصفیہ و نور کا رجحان بھی اسی طرف تھا۔ مچھندر دونوں میں نون کے بغیر ہے۔

یہ فیصلہ بھی قابل تسلیم نہیں۔ مونچھ میں نون غنہ ہے تلفظ میں بھی اور کتابت میں بھی۔ لہذا صحیح املا مع نون ہے۔ یہ لفظ مرکب معلوم ہوتا ہے۔ مونھ + چھاں سے۔ یعنی مونھ کا سایہ یا سائبان یا مونھ پر چھائی ہوئی چیز۔ گھس گھسا کر مونچھ رہ گیا۔ لفظ مونھ میں نون غنہ ہے وہی اس میں بھی ہے۔ مچھندر میں سے واو مع نون بالکل ساقط ہو چکا ہے۔

پہنچنا، لوہار صـ۲۵۳

فاضل مصنف کی رائے ہے کہ لفظ پہونچنا کو بغیر واو کے لکھنا چاہیے۔ اور لُہار در اصل لوہار ہے۔ مگر چونکہ تلفظ میں سے واو ساقط ہو چکا ہے اس لئے کتابت میں بھی نہیں رہنا چاہیے۔ میں ابتدائے عمر سے نادانستگی کی بنا پر پہنچنا کو بغیر واو کے لکھنے کا عادی ہو گیا ہوں۔ مگر مع واو (پہونچنا) کو بھی جائز بلکہ بہتر سمجھتا ہوں۔ اس میں واو معدولہ نہیں ہے۔ تلفظ میں بھی واو ہے۔ جن الفاظ میں حرف اول مفتوح کے بعد ہائے ہوز آتی ہے ان میں اگرچہ ہائے ہوز بھی مفتوح ہو۔ لیکن عام لہجے میں بکسرۂ مجہولہ اس کا تلفظ ہوتا ہے۔ جیسے بہکنا، ٹھہرنا، چہکنا، دہکنا، مہکنا۔ اور جہاں ہائے ہوز ساکن ہوتی ہے، وہاں حرف اول کے فتحہ کا کسرہ کی طرف جھکاؤ ہوتا ہے۔ جیسے بہنا، رہنا، سہنا لیکن پہونچنا میں حرف دوم (یعنی ہائے ہوز) مضموم ہے۔ اور ضمہ کا بھی کھینچ کر تلفظ کیا جاتا ہے۔ اس تلفظ کی وجہ سے بھی اور اس کی امتیازی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے بھی پہونچنا میں واو کا لکھنا ضروری ہے۔

التباس سے بچنے کے لئے کلائی کے معنی میں پہنچا اور زیور کے معنی میں پہنچی، بغیر واو کے لکھنا چاہیے۔ ان میں معنی مصدری نہیں ہیں۔

لوہاہار، ویسے ہی پٹ پٹا کر بچیک چکا تھا۔ یعنی لفظ ہار تو پورا موجود ہے، لوہا
آدھا رہ گیا۔ اب اگر واؤ پر بھی گھن چلا دیا جائے تو صرف لام رہ جاتا ہے۔ لہذا
لفظ لوہار کا املا واؤ کے ساتھ ضرور رہنا چاہیے۔ جبکہ تلفظ میں بھی خفیف واؤ موجود ہے۔

جوڑواں، جوتائی، اونٹنی، اونچائی، دوہائی ص ۲۵۵

لکھتے ہیں :۔ آصفیہ میں جوڑواں، نور میں صحیح طور پر جُڑواں لکھا گیا ہے۔
جتائی جتاؤ۔ آصفیہ میں جوتاؤ بواؤ معدولہ ہے۔ جُتائی اس میں موجود
نہیں۔ واؤ پرانی لکھاوٹ کی نشانی ہے اور بس۔ نور میں دونوں
لفظ صحیح طور پر لکھے ہوئے ہیں یعنی جُتائی اور جُتاؤ۔ اُونٹنی، آصفیہ
میں اونٹنی ہے مع واؤ۔ حالانکہ تلفظ میں واؤ نہیں۔ نور میں واؤ
کے بغیر ہی ہے۔ اُنچائی دونوں میں واؤ کے بغیر ہے۔ دُہائی، آصفیہ میں
"دہائی یا دوہائی" لکھا ہوا ہے۔ مگر اس کے مرکبات کو واؤ کے بغیر
لکھا گیا ہے۔ آگے لکھتے ہیں۔ اب اس لفظ کی صرف ایک صورت
"دُہائی" بغیر واؤ کے صحیح ہے۔

گذارش ہے کہ اہل دہلی لفظ جوڑواں میں واضح طور پر واؤ مجہول کا تلفظ کرتے ہیں
بغیر واؤ کے غلط ہے۔ یہ لفظ جوڑ یا جوڑی سے بنا ہے جس کے معنی جفت عدد کے ہیں (نہ کہ
طاق)۔ اصل کے لحاظ سے واو رہنا ضروری ہے۔ وہ دو بچے جو ایک حمل سے پیدا
ہوئے ہوں اور آپس میں ملصق یعنی جُڑے ہوئے نہوں۔ اور اگر دونوں کے جسم آپس میں
جڑے ہوئے ہوں تو اُن کو جُڑواں (بغیر واو) کہہ سکتے ہیں۔ مگر ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے۔
اور ایسے جُڑے ہوئے بچے زندہ بھی نہیں رہتے۔ بدیں وجہ اس مفہوم کے لئے کوئی مستقل
لفظ رائج نہیں ہوا۔ ایسے موقع پر یہی کہا جاتا ہے کہ دو بچے جُڑے ہوئے پیدا ہوئے۔
اونچائی میں بھی واو معروف کا تلفظ موجود ہے۔ اگرچہ اونچا کی بہ نسبت کچھ ہلکا
ہے۔ اونچا سے اونچائی بنا ہے۔ اگر اس میں بھی واؤ لکھا جائے تو کوئی گناہ نہیں ہوگا۔
جوتاؤ اور جوتائی میں واؤ مجہول کا تلفظ موجود ہے۔ جُتاؤ اور جتائی کوئی لفظ
نہیں۔
اُنٹنی بغیر واؤ کے ہم نے تو کہیں نہیں سنا۔ بہر حال اس میں بھی واو لکھنا ضروری

ہے اور تلفظ میں واؤ اونٹنی کا اسکی گردن کی طرح واضح اور لمبا ہے لنگور میں بھی اتنا لمبا نہیں ہے۔
دوہائی اور دہائی یعنی عشرہ میں امتیاز رکھنے کے لئے اگر ایک میں واؤ لکھا جائے
تو اچھا ہی ہے۔ خرابی کوئی نہیں۔
یہ عجیب مضحکہ انگیز کلیہ ہاتھ آگیا ہے کہ غیر ملفوظ کو کتابت میں بھی نہیں آنا چاہیے
آپ جب موقع، موضع، مصرع کی جمع بنا کر بولتے ہیں تو انصاف سے فرمائیے کہ کیا واقعی عین
کا تلفظ ہوتا ہے؟ املا میں آپ عین لکھتے ہیں؟ یا موقوں، مصروں وغیرہ لکھتے ہیں؟ اور
اگر کوئی یہ کلیہ بنالے کہ ملفوظ کو ضرور کتابت میں آنا چاہیے تو آپ روٹھ تو نہیں جائیں گے؟
بہت اچھا ہوگا۔ کتابت بالکل تلفظ کے مطابق ہو جائے گی۔ املا کے اختلافات سب مٹ
جائیں گے۔ جیسے

کُ ءِ میرِ دل سِ پوچھے تِرِ تیرِ نیم کشِ کو — یِ خلش کہاں سِ ہوتی جُ جگرکِ پار ہوتا
کِ ہوگا باعثِ افزائشِ سوزِ دروں وہ بھی — نَ کرتا کاش نالا مجکُ کیا معلوم تھا ہمدم

دودھیل، دوہرا، گومڑا، گوکھرو، گولائی، گلاوٹ ص ۲۶۰

فاضل مصنف لکھتے ہیں: — دودھیل۔ جب واؤ غیر ملفوظ ہے تو لکھنے کی
کیا ضرورت؟ یہاں وہی صورت ہے جیسے لوہا کی رعایت سے کچھ لوگ
لوہار لکھتے ہیں۔ یہ سمجھنے کے باوجود کہ واؤ غیر ملفوظ ہے۔ اسی طرح دودھ
کی رعایت سے دودھیل فرض کر لیا گیا۔ اس کا املا ددھیل (واؤ کے
بغیر) صحیح ہے۔ دوہرا بھی بغیر واؤ کے لکھا جائے گا۔ گومڑ، گومڑا،
گمڑا، گوکھرو، گکھرو — گومڑ تو مع واؤ ہے، گومڑا اور گمڑا دونوں
مستعمل ہیں۔ یہی صورت گکھرو اور گوکھرو کی ہے۔ نظم میں عموماً گوکھرو
ملتا ہے۔ اور بول چال میں واؤ کے بغیر ہے۔ املا میں یہی بات ملحوظ
رکھی جائیگی۔ اگر مع واؤ نظم ہوں تو مع واؤ لکھے جائیں گے ورنہ واؤ
کے بغیر۔ گلائی، گولائی — دونوں لفظ مستعمل ہیں اور املا میں استعمال
کے مطابق اختلاف نگارش رہے گا۔ گلاوٹ واؤ کے بغیر لکھا جائیگا۔

کیوں حضور! یہ اختلاف نگارش موجب انتشار تو نہیں ہوگا؟ بڑی عجیب بات
ہے۔ خود ہی ایک غلط تلفظ فرض کیا جاتا ہے اور فوراً سند فصاحت دیدی جاتی ہے

یہ زبان اور لغت وادب کی بڑی عجیب قسم کی خدمت ہے۔

سُنیے۔ دودھیل میں واو کا لکھنا بھی ضروری ہے اور واؤ کا تلفظ بھی ضروری ہے۔ دودھ کا لفظ پورا اس میں ہے اور رہنا چاہیے۔ یل برائے نسبت ہے۔ دوہرا میں واؤ لکھنا ضروری ہے تلفظ میں ہو یا نہو۔ آپ کا یہ نظریہ کہ جب تلفظ میں نہیں ہے تو کتابت میں بھی نہیں رہنا چاہیے۔ نہایت غلط اور نامعقول ہے۔ تلفظ اور املا میں مطابقت نہ انگریزی میں ہے نہ عربی میں نہ فارسی نہ فرنچ میں۔ ان کے علاوہ دنیا کی دوسری زبانوں سے ہم واقف نہیں۔ لغات مفرد ہوں یا مرکب ان کے تغیرات میں اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنے مادّہ اور ماخذ سے قریب تر رہیں۔ قصداً ان کی شکل بگاڑتے رہنا اور ہر جاہلانہ تغیر کو قبول کرتے رہنا زبان پر بڑا ظلم ہے۔

گمڑا، گکھرو، گلاوٹ، گلائی یہ سب فرضی تلفظ ہیں۔ فصحائے اہل زبان گومڑا، گوکھرو، گولائی واؤ کے ساتھ بولتے ہیں۔ اور واؤ کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اور آپ کے مشورہ کو قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ گلاوٹ انشا کے اختراعی الفاظ میں سے ہے یہ کبھی کہیں نہیں بولا جاتا۔

پھر استثنا ص ۲۶۲

اب فاضل مصنف بلیٹی کھاتے ہیں۔ جیسا بولو ویسا ہی لکھو! کلیہ بنا کر پھر استثنا؟ بلکہ نظریہ میں ترمیم؟ متقدمین تو آپ کے نزدیک بڑے گنہ گار تھے۔ لیکن آپ نے یہ اکھیڑ پچھاڑ کر کے دماغ کو اور ذوق سلیم کو کونسا سکون عطا فرمایا؟ لکھتے ہیں:۔

> بہت سے مرکبات ایسے ہیں جن کا پہلا ٹکڑا "دو" ہے۔ ان میں خالص فارسی مرکبات بھی ہیں اور مہند مرکبات بھی ہیں ان میں سے بعض مرکبات میں واؤ کا تلفظ نسبتاً واضح طور پر ہوتا ہے۔ جیسے دودلا، دورخا۔ لیکن اکثر مرکبات میں واؤ کا تلفظ نہونے کے برابر ہے۔ شروع سے ایسے مرکبات واؤ کے ساتھ ہی لکھے جاتے رہے ہیں۔ ان کی یہ لکھاوٹ کسی اختلاف یا تفریق کے بغیر مروج اور متعارف ہے۔ ایک لحاظ سے یہ ٹھیک بھی ہے کہ اصل ترکیبی اجزا

برقرار رہتے ہیں۔ فارسی میں بھی یہی کہا گیا ہے۔

در نوشتن اینگونہ کلمات بہتر آنست کہ رعایت اصل را منظور دارند و بوجہے کہ اصل کلمہ را نشان میدہد بنویسند۔ (املائے فارسی لغت نامۂ دہخدا)

آگے فاضل مصنف نے مستثنیٰ الفاظ تقریباً ۴۶ عدد لکھے ہیں۔ مثلاً دوآبہ، دوائی، دوسوتی، دوزانو، دوگانہ، دوہترا، دوہاجو وغیرہ۔ کیا ان الفاظ میں واؤ کا تلفظ ہوتا ہے؟

دوپٹہ ص۲۶۲

پٹہ کی طرح پٹہ اور دوپٹہ کا املا بھی ہائے مختفی سے مرجح ہے۔ فرق و امتیاز کے لئے کتے کے گلے کے پٹے کو الف سے لکھ سکتے ہیں۔

ہندوستانی ص۲۶۴

فاضل مصنف لکھتے ہیں:۔ ہندوستان میں اصلاً واؤ ہے نظم میں باظہار واؤ بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ یہ مصرع تو شاید سبھی نے سنا ہوگا — "اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستان"۔ بول چال میں عموماً واؤ کے بغیر آتا ہے۔ اس لفظ میں واؤ کو لکھنے نہ لکھنے کی بحث پہلے بھی ہو چکی ہے۔ الہ آباد کی ہندوستانی اکیڈمی اور اس کا ماہی رسالہ ہندستانی واؤ کے بغیر ہی لکھے جاتے تھے۔ اس کو واؤ کے بغیر ہندستان لکھنا چاہیے۔ یہی صورت ہندستانی کی ہوگی۔ نظم کی ضرورت سے جب یہ باشباع آئے گا تو اس کا املا خود بخود ہندوستان ہو جائے گا۔

گذارش ہے کہ ہندوستانی کے لفظ میں سے واؤ کو اس وقت حذف کیا گیا تھا جب گاندھی جی نے کانگرس میں یہ تجویز پاس کرائی تھی کہ سوراج کے بعد ہندوستانی زبان ملک کی قومی و سرکاری زبان ہوگی۔ اس کی تعریف یہ کی گئی تھی کہ — "وہ زبان جو تمام شمالی ہند میں بولی جاتی ہے، دیوناگری اور فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے"۔ یہ نیا نام اس لئے تجویز کیا گیا تھا کہ اُردو کا لفظ پسند نہیں تھا۔ اردو والوں نے اس کو بھی گوارا کیا، بلکہ ایک قدم اور بڑھایا کہ لفظ ہندوستانی میں سے واؤ کو حذف

کرنے کا مشورہ دیا۔ کچھ دنوں تک تو میں نے بھی اسی طرح لکھا لیکن جب وہ پردہ ہٹ گیا اور اقتدار ہاتھ میں آجانے کے بعد ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کو سرکاری قرار دیدیا گیا تو میں نے قدیم املا اختیار کرلیا۔ کیا الٰہ آباد کی ہندوستانی اکادمی کو معلوم نہیں کہ ہندوستانی یا ہندستانی کسی زبان کا نام نہیں ہے بس ہندی ہے یا اردو۔

اُردو کے حامیوں کو کانگریس کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ اس نے خود ہی اس پردے کو ہٹا دیا اور اردو کے نام کو زندہ رہنے کا موقع دیدیا۔ واضح ہو کہ تماہی کوئی پڑھے لکھے اور شایستہ لوگوں کی زبان نہیں ہے، اگر آپ سہ روزہ کو تروزہ کہنا پسند کریں تو بیشک تماہی بھی کہیے۔

بوالعجب، بوالہوس، بوالفضول ص ۲۶۷

لکھتے ہیں:۔ بُل ہوس میں بُل فارسی کا کلمہ ہے، بہت کے معنی میں۔ صاحب فرہنگ جہانگیری نے لکھا ہے۔ "بُل با اول مضموم دبثانیِ زدہ، دو معنی دارد۔ اول احمق، دوم بمعنی بسیار آمدہ۔ چنانچہ بُلہوس و بُلکامہ بمعنی بسیار ہوس و بسیار کام بود"۔ یہی بات برہان قاطع میں کہی گئی ہے۔ اردو میں اسے بوالہوس بھی لکھا جاتا ہے۔ مرحوم اثرلکھنوی بُل ہوس لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے فرہنگ اثر میں اس کی صراحت کی ہے۔ بہرطور اصلاً کلمۂ اول بُل ہے اور اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں اس لئے بل ہوس اور بُل عجب ہی لکھنا چاہیے۔ آگے احمد بہمن یار کا اقتباس دیا ہے جو فرہنگ جہانگیری کی تائید میں ہے۔

بڑی دور کی کوڑی لائے۔ یہ جدت سب سے نرالی ہے۔ صدیوں کے متروکہ ایرانی رواج کو ہندوستان میں زندہ کرنا نہ صرف جدت ہے بلکہ بڑی خدمت ہے اردوئے معلی کی۔

فرہنگ جہانگیری، برہان قاطع، لغت نامہ دہخدا کے حوالہ سے جو بات کتاب میں لکھی گئی ہے ہم مان لیتے ہیں کہ وہی صحیح ہے۔ لیکن غور طلب یہ امر ہے کہ اردو میں تو یہ الفاظ قلیل الاستعمال ہیں اور فارسی والوں نے آج تک ان کا املا نہیں بدلا۔ سلیمان حییم نے بوالعجب، بوالعجبی، بوالہوس، بوالہوسی، بوالفضول سب کو متعارف املا سے

لکھا ہے۔ اور بلکامہ، بلخاک، بلغندہ میں سے کوئی لفظ اس نے نہیں دیا۔ صاحب غیاث نے اور صاحب آصفیہ نے بھی میر عبدالواسع و فرہنگ جہانگیری اور برہان قاطع کی تائید نہیں کی۔ پھر بلا وجہ ایک نامانوس املا اختیار کرنے اور انتشار پیدا کرنے سے کیا فائدہ؟

پھوہارا، پھوہارا ص ۲۷۷

فاضل مصنف نے لفظ "پھوہار" کے بارے میں اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے لفظ "پھوہارا" کے بارے میں لکھا ہے کہ فوارے کی ایک عوامی صورت "پھوارا" کو بھی مع واو لکھا جائے گا۔ یہ بھی اسی طرح مستعمل ہے۔"

عرض ہے کہ دراصل اس کا صحیح املا پھوہارا ہے۔ پھو کے معنی اسپرے کے ہیں۔ (دیکھیے پھونک، پھوہا، پھوئیاں) ہار کے معنی "والا" یعنی پانی اڑانے والا۔ آپ نے دیکھا ہوگا دھوبی (خاصکر اونی کپڑے دھونے اور رنگنے والے) موہ میں پانی بھر کر پھو پھو کر کے کپڑوں پر پانی چھڑکتے ہیں پھر استری کرتے ہیں۔ لفظ ہارا باضافہ الف ایسا ہی ہے جیسے لکڑ ہارا۔

پھوہارا بالکل اردو لفظ ہے۔ عربی لفظ فوارہ بفتح اول بروزن علام صیغہ اسم مبالغہ ہے۔ معنی اتفاق سے قریب قریب ہیں۔ دونوں کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔ اب اردو پھوہارا کا املا جو آپ چاہیں پسند کریں۔

چھوہارا۔ ہم نے اپنے اکابر کو اسی طرح لکھتے دیکھا۔ یعنی واؤ بھی اور ہائے ہوز بھی۔ اس کی اصل تحقیق طلب ہے۔ اس کی وضع تو پھوہارا جیسی ہے۔ اور چھو کے معنی پھونک مارنا ہیں۔ شاید اسی سے مرکب ہوا ہو یعنی ہوا کھایا ہوا خشک۔

ہائے ملفوظ ص ۲۸۰

فاضل مصنف نے ہائے ملفوظ وغیرہ پر لمبی بحث کی ہے اور فن خطاطی پر بھی گل افشانی کی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ

ہائے ملفوظ وہ ہے جس کو مستقل حرف کی حیثیت سے استعمال کیا جائے اور واضح طور پر تلفظ میں آئے۔ جیسے ہوا، جگہ، بہت، راہ۔ اس کی چار شکلیں مستعمل ہیں۔ جب یہ لفظ کے شروع میں آئے گی تو "ب" کے شوشے کی طرح لکھی جائے گی اور علامت کے

طور پر ایک مزید شوشہ اس کے نیچے لگایا جائیگا ۔ اس شوشے کو عوامی زبان میں لٹکن بھی کہتے ہیں ۔ جیسے ہوا ، ہبوط ، ہے ، ہمزہ ، ہاتھ ، جب یہ لفظ کے بیچ میں آئے گی تو کہنی دار لکھی جائے گی ۔ جیسے بہت بہو وغیرہ ۔ نیچے والا شوشہ اس میں بھی لازمی ہے ۔ جب یہ آخر میں آئیگی تو اگر منفصل ہے تو گول لکھی جائے گی ۔ جیسے راہ ، ماہ ۔ اور اگر متصل ہے تو ہائے مختفی کی طرح لکھی جائے گی ۔ مگر نیچے والا شوشہ (یعنی لٹکن) یہاں بھی آئے گا ۔ اور یہی شوشہ اس کی پہچان ہوگا ۔ کہ یہ ہائے مختفی نہیں ، ہائے ملفوظ ہے ۔ جیسے جگہ ، یہ ، کہ ، منہ ۔ اگر ایسے مقامات پر یہ شوشہ نہیں لگایا جائے گا تو ہائے ملفوظ ہائے مختفی میں بدل جائے گی ۔ اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے ۔ جیسے ایک لفظ ہے "مہ" یہ ماہ کا مخفف ہے ۔ اس میں ہائے ملفوظ ہے ۔ لفظ خامہ کا آخری جز بھی "مہ" ہے ۔ اس میں ہائے مختفی ہے ۔ اب اگر ماہ کے مخفف "مہ" کو بھی بغیر لٹکن کے لکھا جائے تو ظاہر ہے کہ بالکل غلط لکھاوٹ ہوگی ۔ غالب کا مصرع ۔ "نہ فلک آئنہ ایجاد کف گوہر بار" ۔ اسی کو اگر یوں لکھا جائے ۔ نہ فلک آئنہ ...... تو لفظا ہی مشکوک ہو جائے گا ۔ جب تک اس کے نیچے لٹکن نہ ہو اس کو نہ پڑھا ہی نہیں جا سکتا ۔ غالب کا مصرع ـــ "نہ کہہ کہ طاقتِ رسوائی سوال نہیں" تین لفظ یکجا ہیں ۔ اول دسوم میں ہائے مختفی ہے ۔ بیچ والا کہہ فعلی امر ہے ۔ اس میں ہائے ملفوظ ہے ۔ صرف لٹکن ان الفاظ میں امتیاز کو باقی رکھتا ہے ۔

گزارش ہے کہ " ابتدائے لفظ میں ہ آتی ہے تو " ب " کے شوشے کی طرح نہیں لکھی جاتی ۔ بے کے شوشے اور " ہ " کی گھنڈی میں بہت فرق ہے ۔ فن خطاطی میں اجتہاد اور قیاس آرائی نہ کیجیے ۔

جس کو آپ غلط نگاری فرما رہے ہیں وہ غلط نگاری نہیں ہے ۔ متقدمین نے بھی املا میں التباسات سے بچنے کے طریقے اختیار کیے تھے ۔ یہ نیچے والا شوشہ جلدی

ہیں اکثر غائب ہوجاتا ہے۔ اور پرانی تحریرات میں شوشہ (یا ٹکن) لکھنے کی پابندی نہیں تھی۔ فعل امر کو دو ہاؤں سے لکھتے تھے۔ کہہ۔ بہہ۔ سہہ، تاکہ کاف بیانیہ حرف جار اور نام عدد سے التباس نہ ہو۔ اور التباس سے بچنے کے لئے سیاق وسباق کا علم بھی لازم ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ پڑھنے والا عبارت کے مطلب کو نہیں سمجھ رہا ہے۔

آج تک وہی املا جاری اور متعارف ہے۔ بچہ بچہ سمجھتا اور پڑھتا ہے۔ کوئی مسخ نہیں ہے۔ بچوں کو شروع میں ہی سمجھایا اور بتایا جاتا ہے کہ فعل امر کو اس شکل میں التباس سے بچنے کے لئے لکھتے ہیں۔

میں پھر عرض کرونگا کہ فلالوجی کا انداز فکر اور ہے اور منطقی موشگافی اور ہے۔ محاورات اور املا میں فلالوجی کا انداز فکر ہونا چاہیے۔ ذوق سلیم کو طاق نسیاں پہ رکھ دینا اور عرف عام کو بالکل نظر انداز کر دینا سخت نادانی اور لسانیات سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

ایک جگہ تو آپ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ۃ کے ساتھ تنوین نصبی میں ہر جگہ الف لکھا جائے کیونکہ یہ جاننا دشوار ہے کہ کونسی ۃ اصلی ہے اور کونسی زائدہ؟ وقتاً میں بھی اور دفعتاً میں بھی سب میں الف لکھا جائے۔

یہاں آپ مشورہ دے رہے ہیں کہ کاف بیانیہ (کہ) اور فعل امر (کہہ) — عدد (سہ) اور فعل امر (سہہ)۔ حرف جار (بہ) اور فعل امر (بہہ) ان سب کو ایک ہ سے لکھو۔ اول میں ٹکن نہ لٹکاؤ کیونکہ وہ ہائے مختفی ہے اور فعل میں ضرور لٹکاؤ کیونکہ وہ مادہ کی ہ ہے۔ کیا یہ سوال پیدا نہیں ہوگا؟ کہ لوگ لکھتے وقت کیونکر امتیاز کرینگے ہائے مختفی میں اور ہائے مادہ میں؟ ایک دفعہ تو آپ کا قلم بھی ٹھٹک جائے گا کہ لفظ "بہ" میں ٹکن لگائے یا نہیں۔ ما گفتہ بہ میں کہاں ٹکن ہوگا اور کہاں نہیں؟ اگر توبہ نوحہ، جگہ وغیرہ میں ٹکن نہ ہو تو کیا ان الفاظ کا پڑھنا دشوار ہوگا؟

آپ کہتے ہیں کہ فعل امر کو اگر کہہ، سہہ، بہہ لکھدیا تو لفظ ہی مسخ ہوگیا۔ دو حرفی کے بجائے سہ حرفی ہوگیا۔ یہ تو فرمائیے کہ آپ کے نزدیک خواجہ، بالکل، فوق البھڑک میں کتنے کتنے حرف ہیں؟

غالب کے دونوں مذکورہ مصرعوں میں آئنہ اور کاف بیانیہ کی ہائے مختفی تلفظ میں نہیں آرہی ہے۔ اس کو آپ نے کتابت میں کیوں باقی رکھا ہے؟ نہ کے اوپر پیش ضرور لگائیے مشکل آسان ہو جائیگی۔

اور کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ کاف بیانیہ (کہ) حرف جار (بہ) حرف نفی (نہ) ان میں درحقیقت ہائے مختفی کا وجود ہے بھی؟ یا محض املا کی وجہ سے فرض کرلی گئی ہے۔ کیا کبھی ہ کا تلفظ ہوتا ہے؟

سُنیے۔ حرف جار یا تو "ب" ہے یا "با" جیسے باوقار باعزت ہیں۔ یہ بروزن فع کہیں نہیں۔ حرف نفی یا "ن" ہے یا "نے" یا "نا" جیسے "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں اور نا بابیں باز آیا" "نہ" بروزن فع کہیں نہیں۔ اور کاف بیانیہ کو بروزن فع کبھی اساتذہ نے جائز نہیں رکھا۔

پھر آپ یہ بھی حکم دیتے ہیں کہ ان حروف کو اسم کے ساتھ ملا کر نہ لکھو الگ لکھو۔ مثلاً روز بروز، نام بنام وغیرہ لکھنے سے منع کیا گیا۔ روز بہ روز، نام بہ نام لکھنے کی ہدایت کی گئی۔ یہ ہائے مختفی کہاں سے آگئی؟ ہائے مختفی تو اسموں میں آتی ہے اور اسکی پہچان یہ ہے کہ اضافت میں اس کا تلفظ ہمزہ سے تبدیل ہو جاتا ہے جیسے غنچۂ نو، دستۂ گل، نالۂ بلبل۔ فرق دیکھیے مہ نو، خامۂ شکستہ۔ معلوم ہوا کہ تلفظ میں جو تنہا ایک حرف ہے، وہی املا میں دو حرفی ہے۔ تو اگر یوں کہا جائے کہ فعل امر تلفظ میں دو حرفی ہے اور اسی کا املا سہ حرفی۔ تو کوئی گناہ تو نہیں ہوگا؟

اللہ اللہ! پھر وہی استثنا! وہی گناہ جو متقدمین نے کیا تھا! فاتحہ، مصافحہ، مشافہہ، مواجہہ وغیرہ میں آخری "ہ" کا لشکن کیوں نہیں لگے گا؟ اس استثنا کی کوئی معقول وجہ؟

آپی صفحہ ۲۹۶

لکھتے ہیں:۔ "ہی" حرف حصر ہے۔ جب یہ "آپ" کے ساتھ آتا ہے اور یہ مرکب فعلن کے وزن پر استعمال کیا جاتا ہے تو اس کو دو طرح لکھا جاتا ہے۔ آپی اور آپھی۔ امیر اللغات میں ہے کہ "بعض لوگ آپی کو آپھی بہائے مخلوط لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ مؤلف کی رائے ہے کہ

ایسے مقامات میں ہائے مخلوط کا ترک کرنا تحریر اور تقریر میں مستحسن ہے"۔ یہ رائے نہایت مناسب ہے، اور اب اس لفظ کا یہی املا اختیار کرنا چاہیے۔ فاعلن کے وزن پر آئیگا تو آپ ہی لکھا جائیگا۔

دل ہے جیسے گھڑی فرنگی کی — آپ ہی آپ ہے پکار اٹھتا

کیا بلا اس جوان پر آئی — کھل گیا آپی آپ کچھ قائم

ہم آپی سوگوار بنے اپنے واسطے — جب کوئی بھی ملا نہ ہمیں اپنا دردمند

آپی کی طرح ایک ہی کا مخفف ایکی آتا ہے اور اب اسکو ابھی کوئی نہیں لکھتا۔ رشک کا شعر ہے :-

ایکی ہیں ناتوان و توانا زمین میں — ہے امتیاز عاجز و ظالم زمین پر

ایکا ایکی اسی طرح بنا ہے۔ اور اسی قیاس پر آپی کو مرجح قرار دینے کی ایک اور وجہ ہاتھ آئی۔ ہی کی ہائے ہوز کا حذف کچھ انھی دو لفظوں سے مخصوص نہیں "کسی مجھی تجھی اسی" میں بھی ساقط ہو جاتی ہے۔ الخ

عرض ہے کہ آپ ہی، ایک ہی کا املا آپی، ایکی بالکل متروک ہے۔ اب کوئی اس طرح نہیں لکھتا۔ ایکا ایکی کا محاورہ اور ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے دیکھا دیکھی۔ اس میں الف تکرار کے لئے ہے اور "ی" ہی کا مخفف نہیں ہے۔ شرما شرمی، گرما گرمی وغیرہ اور بھی ایسی مثالیں ہیں۔ کسی مجھی اسی کے قیاس پر آپی کو جائز قرار دینا صحیح نہیں۔ محاورہ میں قیاس کا دخل نہیں۔ رواج و عرف مقدم ہے۔ انھی کوئی املا نہیں۔ اس قسم کے الفاظ کی صحیح صورت درج ذیل ہے :-

یوں ہی، ان ہی، تم ہی، ہم ہی۔ ضرورت شعری میں الگ الگ کر سکتے ہیں ورنہ یونہیں، انھیں، تمھیں، ہمیں ٹھیک ہے۔ یہیں ہی، جوں ہی، توہی۔ ہر حال میں الگ الگ رہیں گے۔ ابھی، کبھی، جبھی، سبھی، مجھی، تجھی۔ ہر حال میں صورت مرقومہ پر رہیں گے۔ وہی، یہی، اسی، کسی۔ ہر حال میں مرکب رہیں گے۔

ہتھیلی ص۳۴۲

لکھتے ہیں کہ ہتیلی، ہتیار، ہتکڑی، ہتیالینا۔ اصلاً ان میں ہائے مخلوط

ہے۔ مگر بول چال اور تحریر خاص طور سے اخباری زبان میں ہائے مخلوط ساقط ہو چکی ہے اور ترکیبی بناوٹ ہتھ پھول، ہتھ پھیری کی طرح نہیں رہی۔ لہٰذا مذکورۂ بالا الفاظ میں ہائے مخلوط نہیں لکھی جائیگی۔

عرض ہے کہ ہتھیلی، ہنپھیار، ہتھکڑی، ہتھیانا۔ سب میں ہائے مخلوط ضرور لکھی جائیگی اور ہائے مخلوط کا تلفظ بھی رہے گا۔ سب سے زیادہ تو اخبارات نے ہی زبان کی فصاحت کا بیڑا غرق کیا ہے۔ اور ماشاء اللہ آپ اخباری زبان کی سند پکڑ رہے ہیں۔ اور خطاطی سے آپ کی یا آپ کے کاتب کی ناواقفیت یہاں بھی جھلک رہی ہے۔ ہتھ میں "ھ" کی گھنڈی غائب کر دی ہے۔

ہمزہ صفحہ ۲۵۵

لکھتے ہیں کہ — ہمزہ کا سب سے زیادہ غلط استعمال اس طرح ہوتا ہے کہ "ی" کی جگہ ہمزہ لکھ دیا جائے یا غیر ضروری طور پر "ی" اور "واؤ" کے ساتھ ہمزہ کو جمع کر دیا جائے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب لفظ کا آخری ٹکڑا واؤ یا ے یا ی ہو۔ کہ اکثر صورتوں میں ان حرفوں کے ساتھ ایک عدد ہمزہ کو بھی نتھی کر دیا جاتا ہے۔ گویا لفظ کی صورت کو مسخ کر دیا جاتا ہے۔ کبھی غیر ضروری طور پر الف کے ساتھ اس کو منسلک کر دیا جاتا ہے جب کہ دونوں لفظ ہم آواز ہیں۔ غلطی سے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ جب لفظ کے آخر میں ی یا ے ہو تو اضافت کی صورت میں اس ی یا ے پر ہمزہ ضرور لکھنا چاہیے۔ ورنہ اضافت کا حق ادا نہیں ہوگا۔ یہ غلط نگاری کی انتہا ہے کہ اضافت کے ایک زیر کے لئے دو حرف ی اور ہمزہ اکٹھا کیے جائیں۔ آگے لکھتے ہیں کہ ایک آواز کے لئے دو حرفوں کو یکجا نہیں کیا جائیگا۔

عرض ہے — فاضل مصنف کا انداز فکر چونکہ منطقیانہ ہے اس لئے متقدمین کے سب کام ان کی نظر میں غلط اور مسخ ہیں۔ واضح ہو کہ جن الفاظ کے آخر میں الف

ہوتا ہے مضاف ہونے کی صورت میں ایک "ئے" یا "ئ" یعنی یا مع ہمزہ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسے خدائے سخن۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر کیا ہو؟ خوب غور کیجئے۔ منطقی ذہنیت کو تھوڑی دیر کے لئے بالائے طاق رکھ دیجیے۔ اور عملی چیز کا عملی تجربہ کیجیے۔ مذکورہ مرکب اضافی کا تلفظ کیجیے مگر شرط یہ ہے کہ حروف کو صحیح مخرج سے ادا کیجیے گا۔ کیا اس کا تلفظ خدایِ سخن ہے؟ دیکھیے انصاف کے ساتھ ہی کا تلفظ اس کے مخرج سے صحیح صحیح ہو! اگر آپ کہیں کہ اس کا یہ تلفظ تو کوئی نہیں کرتا۔ اچھا! اگر یہ نہیں تو کیا خداءِ سخن ہے؟ دیکھیے دیکھیے ہمزہ حرف حلقی ہے۔ حلق سے جھٹکے کے ساتھ نکلتا ہے آپ کہیں گے کہ یہ تلفظ بھی کوئی نہیں کرتا۔ تو پھر فرمائیے۔ نہ یَ کا تلفظ ہے نہ ہمزہ کا تو پھر کونسے حرف کا تلفظ ہوتا ہے؟ بار بار الٹ پلٹ کرکے تلفظ کا عملی تجربہ کیجیے صاف واضح ہو جائیگا کہ یہاں خالص یِ کا بھی تلفظ نہیں ہے اور خالص ہمزہ کا بھی نہیں ہے۔ ایک تیسری آواز ہے۔ اس کو ظاہر کرنے کے لئے حروف ہجا میں کوئی حرف موجود نہیں ہے۔ متقدمین کے سامنے جب یہ مسئلہ آیا تو انھوں نے خوب غور کیا کہ اس تیسری آواز کی نشان دہی کس طرح کی جائے حروف ہجا میں ایک حرف ہمزہ ہی ایسا تھا جس سے یہ کام لیا جا سکتا تھا۔ یہ حرفِ علت ہونے کے باوجود ایسا حرف ہے جس پر حرف علت کے پورے احکام عائد نہیں ہوتے۔ تسہیل کو بھی قبول کرتا ہے (حروف علت کی وجہ سے الفاظ میں جو تغیر ہوتا ہے اس کو تعلیل اور ہمزہ کی وجہ سے جو تغیر ہوتا ہے اسکو تسہیل کہتے ہیں) آخر اسی کو استعمال کیا گیا۔ خدائے سخن اور حاصل مصدر جماؤ، نبھاؤ وغیرہ میں یَ اور واؤ پر ہمزہ لگانے سے یہ ظاہر ہوا کہ واؤ اور یے کا تلفظ ہلکا ہے۔ ی یا واؤ کی آواز اور ہمزہ کی آواز مخلوط ہو کر ایک بین بین آواز پیدا ہوتی ہے۔

اگر ہمزہ جزو لفظ ہے اور اصل مقصود ہمزہ کا تلفظ ہے تو اردو رسم الخط میں صرف ہمزہ بغیر سہارے کے نہیں لکھا جاتا یا تو واؤ کا اضافہ کرتے ہیں۔ جیسے مؤرخ مؤثر علاؤ الدین۔ یا یَ کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے دعائے مستجاب، اقتضائے حال۔ یا یَ کا شوشہ لگاتے ہیں جیسے مائل، قائم۔ اور الف متحرک خود ہی ہمزہ کی آواز دیتا ہے۔

واضح ہو کہ کسی ترکیب میں قاری کو یہ سوچنے کی ضرورت نہیں کہ یہاں واؤ اور یؔ اصل جز ہے یا ہمزہ ؟ مقصد تو ایک تیسری آواز کا اظہار ہے۔

یہ اُردو کا عام املا ہے جو متقدمین نے بڑے غور و فکر کے بعد تجویز کیا تھا ایک آواز کے لئے دو حرفوں کو جمع کرنا کوئی گناہ کبیرہ نہیں ہے۔ دیکھیے، پھیرا، بنگلہ، خواجہ یہ تینوں لفظ چار حرفی ہیں فعلن کے وزن پر۔ لیکن کتابت میں پانچ پانچ حرف ہیں۔ لفظ کیونکر بھی چار حرفی بروزن فعلن ہے اس میں چھ حرف مکتوب ہیں۔ اس کو آپ کہتے ہیں ایک آواز کے لئے دو حرفوں کو جمع کرنا۔ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ دو حرفوں کو ملا کر ایک نئی پیدا شدہ آواز کی نشاندہی کرنا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمزہ ایک حرف کی حیثیت سے خود اپنی بھی مستقل آواز رکھتا ہے جیسے تأثر، جرأت، مؤثر وغیرہ اور حرف علت کے نرم تلفظ کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ جیسے بناؤ جاؤ، چل چلاؤ وغیرہ۔ بالکل اسی طرح ہائے ہوز حرف ہونے کی حیثیت سے خود اپنی مستقل آواز بھی رکھتی ہے اور مخلوط ہو کر تیسری آواز بھی پیدا کرتی ہے۔

جرأت ص ۳۵۹

لفظ جرأت بروزن قدرت ہے الف پر ہمزہ ضرور لگے گا۔ یہی اس کا متعارف املا ہے۔ اسی طرح جن لفظوں میں التباس ہوتا ہو ان میں بھی ہمزہ لگایا جائے۔ مثلاً تامل جنوبی ہند کی ایک زبان کا نام ہے اس لئے تأمّل میں ہمزہ لگایا جائے لفظ قراءت بروزن قیامت ایک اصطلاحی لفظ ہے۔ میں ہمیشہ الف کے بعد ہمزہ لکھتا ہوں۔ لیکن جب کا بیاں دیکھتا ہوں تو پریشان ہو جاتا ہوں۔ کراماً کاتبین ہمیشہ ہمزہ کو الف کے کندھے پر سوار کر دیتے ہیں۔ جیپیاں لگتی ہیں۔ اس کا کوئی دوسرا املا نیز تلفظ مجھے تو بالکل گوارا نہیں خواہ استاد ذوق نے باندھا ہو یا اور کسی نے۔ حالانکہ استاد ذوق میرے دادا استاد بلکہ پردادا ہیں۔

لم بروزن تقدس

ہیئت ص ۳۶۱

اس لفظ میں ہمزہ کے نیچے یؔ کا شوشہ لازمی ہے۔ آپ نے نہیں لکھا۔ ھیئۃ مفرد ہے اس کی جمع ھیئات کو آپ نے ایک جگہ یؔ کے شوشے سے لکھا

ہے اور ایک جگہ بغیر شوشہ۔ ہمزہ کے نیچے ی کا شوشہ واحد، جمع دونوں میں ضروری ہے۔

سائیسی ص ۳۶۷

فاضل مصنف لکھتے ہیں :- درج ذیل الفاظ میں اور ان کے قبیل کے اور سب الفاظ میں واو پر ہمزہ کبھی نہیں لکھا جائیگا اور حاصل مصدر کے واو پر بھی کبھی ہمزہ نہیں آئے گا۔ جیسے الجھاو۔ بناو۔ تناو۔ الاو۔ بھاو۔ پلاو۔ دریاو، الخ جیسے سائیسی علم دریاو ہے۔

گزارش ہے کہ سائس بروزن قائد، سیاست کا اسم فاعل ہے۔ اردو میں پہلے سائیس بنا، پھر سہیس یا سئیس۔ کیا کہنے ہیں! بڑے اونچے درجے کے فصیح و بلیغ زبان ہے۔ سائیسی بھی فصیح، علم بروزن حلم بھی فصیح اور دریاو تو افصح ٹھہرا۔ یہاں آکر فصاحت کا ریکارڈ ٹوٹ گیا۔ واقعی اگر ٹیلیسن اور لڑ بچر (لٹریچر) کو بھی لغت میں درج کر لیا جائے تو معقول بات ہوگی۔

غیاث اور آصفیہ میں صیغہ صفت مشبہ سئیس بروزن رئیس بھی لکھا ہے یہ معلوم نہیں کہاں سے لکھا ہے۔ کسی عربی لغت میں نہیں ہے۔ سیاست کا مادہ (س وس) ہے۔ قاعدہ یہ کہتا ہے کہ اس مادہ سے اگر صفت مشبہ آئیگا تو سید، جید کے وزن پر ستیس (بیائے مشدد مکسور) آئے گا۔ رئیس کے وزن پر نہیں آئے گا۔ اور اگر اس وزن پر آئیگا تو طویل کی طرح سویس ہوگا۔ مگر ان دونوں میں سے ایک بھی میری نظر سے نہیں گذرا۔

دباؤ ص ۳۶۸

لکھتے ہیں :- غالب کا مشہور شعر ہے۔

لاکھوں لگاو ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناو ایک بگڑنا عتاب میں

اس میں لگاو اور بناو دونوں حاصل مصدر ہیں۔ اگر ان کو لگاؤ اور بناؤ لکھا جائے تو یہ فعل بن جائیں گے اور شعر کے معنی ہی چوپٹ ہو جائیں گے۔

خواہ مخواہ فعل بن جائیں گے۔ محض ہمزہ لگانے سے شعر کے معنی چوپٹ ہو جائیں گے؟

سبحان اللہ! سخن فہمیٔ عالم بالا معلوم شد! جو شخص شعر کے وزن سے واقف نہو اس کی سخن فہمی لائق تعجب ہے۔ دباؤ (حاصل مصدر) دباؤ اور دبائے (فعل) ہمزہ سب میں لکھا جاتا ہے۔ یہ ہمزہ کئی خدمتیں انجام دیتا ہے۔ حاصل مصدر میں تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ واؤ کے تلفظ میں شدت نہیں ہے، خفت ہے۔ دوسری بات یہ بتاتا ہے کہ یہ واؤ لفظِ سابق کا جزو ہے۔ اور فعل اصل میں دباؤو، دباوے۔ آوو، آوے۔ جاوو، جاوے، تھے۔ جب واؤ کو ہمزہ سے بدلا تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ الف اور واؤ جمع کے بیچ میں ہمزہ لکھتے (جاءو) مگر واو کے اوپر لکھنے کا رواج پڑ گیا۔ اور رواج پڑنے کی وجہ واضح کی جا چکی ہے کہ اردو رسم الخط میں تنہا ہمزہ بغیر سہارے کے نہیں آتا۔ واو موجود تھا ہی۔ اسی پر ہمزہ لگا دیا۔ اور اب رواج کو حاصل مصدر میں بھی اور فعل میں بھی بدلنا ممکن نہیں۔

اب رہا امتیاز۔ تو وہ عبارت کے سیاق و سباق سے خود بخود ہوتا ہے۔ سیاق و سباق کی مدد سے الفاظ کے معانی کا فہم بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بڑی سے بڑی شخصیت بڑے سے بڑا ادیب اور عالم و فاضل اس کا محتاج ہے۔

آپ سے اگر کوئی شخص کم مائگی کے معنی دریافت کرے تو آپ کہیں گے ناداری۔ لیکن جب وہ مندرجۂ ذیل شعر کا مطلب پوچھے گا:۔

بفیضِ سائلِ شیریں نوا بزمِ ادیباں میں　　　بایں کم مائگی واصف پئے عرضِ ہنر آیا

تو آپ کہیں گے یہاں کم مائگی کے معنی نااہلیت و ناقابلیت کے ہیں۔

"قلب ماہیت" کی ترکیب میں اور "قلب واصف پہ ہوا الہام سالِ عیسوی" میں بغیر کسی امتیازی علامت کے آپ قلب کے معنی متعین کریں گے؟ یا کوئی امتیازی علامت ڈھونڈنے میں لگ جائیں گے؟

کوئی آدمی نظر نہیں آتا سارا باغ سونا پڑا ہے۔ میں آج ذرا جلدی سونا چاہتا ہوں۔ سونا اُچھالتے چلے جاؤ کوئی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا۔ تین جگہ لفظ سونا آیا ہے۔ کیا ایک مکتب کا بچہ بغیر امتیازی علامتوں کے اس کو نہیں پڑھ سکے گا؟ اگر واقعی نہ پڑھ سکے تو آپ اس کو سیاق و سباق پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی مشق کرائیے اور سمجھ کر پڑھنے کی تربیت دیجیے۔ استاد کس لئے ہوتا ہے؟

اللہ اللہ! یہ امتیازی علامتیں! اُلٹا پیش، سیدھا پیش، سیدھا خط، آڑا

خطا، وجود ہمزہ، عدم ہمزہ، ہائے مختفی، الف سے لکھو، لمبی ت سے لکھو، (دَھَلُمَّ جَرّا)
خدا کی پناہ! اس گورکھ دھندے کا یاد کرنا خود ایک مصیبت ہے۔ بچوں کو علامتوں کی
احتیاج کے چکر میں نہ ڈالیے کہ کلمہ اور کلام کا مفہوم تو مؤخر ہو جائے پہلے وہ علامتوں
ہی کو ٹٹولتے رہیں۔

آپ کسی کو پاس بٹھا کر مندرجۂ ذیل جملے بول کر لکھوائیے :۔

وہ بہر ملاقات آئے تو میں بحر ندامت میں غرق ہو گیا۔ تم نے چوکھٹ پر کیوں آری
چلائی؟ ہم تو تمھاری شرارتوں سے عاری آ گئے۔ کوچۂ نعل بندان اس کا مولد ہے اس
کا نال وہیں کٹا۔ مولانا آسی مدراسی بہت بڑے عالم تھے مجھ عاصی کو ان سے کیا نسبت۔
عسل دراصل مکھی کے بچوں کی خوراک ہے۔ اس نے علم بغاوت بلند کیا اور شکست کھا کر
رنج و الم میں گرفتار ہوا۔ عام طور پر لنگڑا آم زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر آواز کو
بلند کرنے کا آلہ ہے اگر اعلیٰ قسم کا ہو تو بگڑتا نہیں۔ بعض لوگ ناصح بن کر کہتے ہیں کہ اس
شغل سے باز آجاؤ۔ اپنی صوابدید سے کام کرو اگر نیت نیک ہے تو ثواب سے محروم نہ رہوگے۔

دیکھیے ـــ بہر اور بحر۔ آری اور عاری۔ نعل اور نال۔ آسی اور عاصی۔ عسل
اور اصل۔ علم اور الم۔ عام اور آم۔ آلہ اور اعلیٰ۔ بعض اور باز۔ صواب اور ثواب۔
تلفظ یکساں ہے۔ آپ نے بولتے وقت کبھی کوئی امتیاز نہیں کیا۔ لیکن لکھنے والا اگر بالکل
جاہل نہیں ہے تو سب کو صحیح املا کے مطابق لکھے گا۔

اسی طرح پڑھنے میں بھی الفاظ کے معانی سیاق وسباق سے سمجھے جاتے ہیں۔ اگر
سیاق وسباق کا فہم نہیں ہے تو جاہل اور عالم سب برابر ہیں۔ اصل بات یہی ہے۔ ہمزہ کا
لکھنا نہ لکھنا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

کماؤ ص ۳۶۹

لکھتے ہیں :ـــ اب مختصراً ان تین قاعدوں کو پھر دہرایا جاتا ہے :ـــ
(الف) ایسے حاصل مصدر جن کے آخر میں واؤ ماقبل الف ہو اُس
واو پر ہمزہ کبھی نہیں آئے گا جیسے بناو، بچاو، وغیرہ (ب) ایسے
اسم فاعل اور بعض اسم مفعول ان میں واو پر ہمزہ ضرور آئے گا اور
واو معروف ہوگا جیسے بکاؤ، پلاؤ وغیرہ (ج) ایسے افعال پر ہمزہ

ضرور آئیگا اور واو مجہول ہوگا ۔ جیسے آؤ ، جاؤ وغیرہ ۔

گذارش ہے کہ مصنف نے کماؤ (فعل امر صیغہ جمع حاضر) اور کماؤ (صیغہ اسم مبالغہ) دونوں کا یکساں املا تجویز کیا ہے ۔ ان دونوں میں مابہ الامتیاز کیا ہوگا ؟ وہی سیاق و سباق ؟ یا کچھ اور ؟

پَلاؤ بمعنی پالتو یوپی کی زبان ہے ۔ پُلاؤ بضم اوّل اور بفتح اوّل میں علامتِ امتیاز کیا ہے ؟

دیو ، خدیو صـ۳۷ـ

دیو ، خدیو وغیرہ میں واو ملفوظ ہے ان میں ہمزہ لکھنا بیشک غلط ہے ۔ اور کوئی لکھتا بھی نہیں ہے ۔ ہم نے تو کہیں لکھا ہوا نہیں دیکھا ۔

موافق صـ۳۸ـ

لکھتے ہیں :۔ عربی کے مندرجۂ ذیل الفاظ میں واو پر ہمزہ ہرگز نہیں لکھا جائیگا :۔ موافق ، مواصلت ، موافقت ، موثر ، موخر ، مودب ، موذن ، مورخ ، موقر ، موکد ، موکل ، مولف ، مولفہ ، مونث ، موید مواخذہ ، موازنہ ، موسس ، موفق ، موجل ، موجہ ، موشح ، مورخہ ۔

موثر ، مونث ، موخر جیسے لفظوں کو بہت سے لوگ مع اضافۂ ہمزہ لکھا کرتے ہیں ۔ عربی میں جو بھی صورت ہو اردو املا کے لحاظ سے یہ غلط لکھاوٹ ہے ۔ ایک حرف (واو) کی جگہ دو حرف (ء و) کیوں لکھے جائیں ؟

فاضل مصنف نے تو اردوئے معلیٰ کا اچھا خاصا پوسٹ مارٹم کر ڈالا ۔ الامان والحفیظ!

تگہ کے تیر چھلنی کر دیا کرتے ہیں سینوں کو

جدھر وہ دیکھ لیتے ہیں اُدھر دیکھا نہیں جاتا (سائل دہلوی)

واضح ہو کہ یہاں پھر وہی اصل مادّہ کی بات آپڑتی ہے ۔ اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ۔ عربی کے الفاظ اگر استعمال کرنے ہیں تو قصداً ان کو مسخ نہ کیجیے ۔ ورنہ ان کے متبادل اُردو کے الفاظ ایجاد کیجیے ۔ اس صنعتی ایجاد کا ٹھیکہ کسی کلا تھ مل کے سپرد کر دیا جائے ۔ جو الفاظ یہاں آپ نے لکھے ہیں ان میں سے بعض الفاظ کے مادّہ کا حرف اول (فائے کلمہ) ء ہے ۔

ایسے الفاظ مزید مشتقات مروجۂ اردو کے ساتھ درج ذیل ہیں :-

مُوافق ـــ موافقت، وفاق، وفق، توفیق، موفق، اتفاق، متفق، مستوفق، توافق

مُواصلت ـــ وصال، وصل، واصل، موصول، ایصال، موصل، اتصال، متصل

وصلی ـ موقر ـ وقار، توقیر ـ مُوکل ـ متوکل، توکیل، وکیل، وکالت، توکل ـ مُوشح، توشیح

مُوازنہ ـ وزن، موزون، میزان، موازین، توزین، اوزان، توازن، متوازن۔

مُوجہ ـــ توجیہ، وجہ، وجوہ، وجاہت، وجیہ، جہت، جہات، توجہ، متوجہ، مواجہہ

بعض الفاظ میں فائے کلمہ الف (باصطلاح عرب ہمزہ) ہے ـ وہ مندرجۂ

ذیل ہیں :-

مؤثر ـــ تاثیر، تاثر، متاثر، اثر، آثار، ایثار، مآثر ـ مآل، تاویل، آلہ، آل، آل،

مؤید ـــ تائید ـ مؤخر ـ تاخیر، تاخر، متاخر، متاخرین، آخرت، اخیر، آخر، اُخروی،

اُخریٰ ـ مؤکد ـ تاکید، مؤکدہ، اکید ـ مؤذن ـ اذان، تاذین، اِذن، استیذان

ماذنہ ـ مؤرخ ـــ تاریخ، ارخ، مؤرخین، مؤرخہ ـ مؤلف ـــ تالیف، مؤلفہ، الفت،

مالوف، اُلف، اُلف ـ مؤنث ـــ تانیث، اُنثیٰ، اناث ـ مؤاخذہ ـــ اخذ، آخذ، ماخوذ،

ماخذ، آخذ ـ مؤسس، اساس، تاسیس، مؤسسہ ـ مؤجل ـ اجل، تاجیل، آجل

واو والے الفاظ میں واو پر ہمزہ ہرگز نہیں لکھا جائیگا اور تلفظ واو کا ہوگا ـ اور ہمزہ

والے الفاظ میں واو پر ہمزہ ضرور لکھا جائیگا اور تلفظ ہمزہ کا ہوگا ـ

اگر پھر بھی پہچان میں دشواری ہو تو ایک آسان سی پہچان اور عرض کرتا ہوں ـ جن

مادوں کا فائے کلمہ واو ہے، ان کے باب تفعیل میں ت کے ساتھ واو لکھا جاتا ہے ـ

جیسے توفیق، توقیر، توکیل، توحید وغیرہ ـ اور جن میں فائے کلمہ ہمزہ ہے ان میں الف لکھا

جاتا ہے ـ جیسے تاثیر، تاخیر، تاریخ وغیرہ ـ

رؤسا ر ص ۳۸۱

ارشاد ہوا ہے :- رئیس کی جمع عربی کے قاعدے سے رؤسا ہوگی ـ حکما

اور علما کے وزن پر ـ یعنی ایک واو اس پر ہمزہ اور ہمزہ پر زبر ـ اس

املا کو عربی سے مخصوص سمجھنا چاہیے ـ اردو میں سادہ طور پر رُءسا

لکھا جائیگا ـ جن صاحب کو یہ صورت پسند نہو وہ زیادہ سادگی کے

ساتھ اُردو کی جمع رئیسوں استعمال کریں۔

عرض ہے کہ اگر ہم (رُءُوسَ ا) بروزن ہیولی استعمال کریں تو کیا ہرج ہے ؟ ہماری ملکیت ہے ۔ جس طرح چاہیں تصرف کریں ۔ یا رئیسوں کے بجائے رہیسوں کہیں ۔ کسی کو کیا حق ہے کہ ہماری شخصی آزادی میں مداخلت کرے ۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے املا کے متعلق بھی حکم صادر فرمایا جائے :۔

رویا (خواب)، فواد (دل) تفاول، تناول، عبدالرؤف، لولو (موتی) لئیم، لئام لومار۔ رؤس جمع راس۔ کوس جمع کاس۔

پھر وہی واؤ ص۳۸

فرماتے ہیں :۔ انگریزی وغیرہ کے ایسے الفاظ جن میں الف اور واؤ یکجا ہیں ان سب میں بھی واؤ پر ہمزہ نہیں لکھا جائیگا ۔ جیسے پاونڈ، ساونڈ گراونڈ، الاونس، پاوڈر، راونڈ، اکاونٹ وغیرہ ۔ یہ اصول ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ایک حرف علت کی جگہ دو حرف علت نہیں آئینگے کوئی لفظ ہو اور کسی زبان کا ہو اصول یہی رہے گا ۔

دو حرف علت الف اور واو تو پھر بھی موجود ہیں ۔ یہ ہمزہ تو تلیین کے لئے ہے ۔ بیکار نہیں ہے ۔ ورنہ مذکورہ الفاظ میں اور مندرجہ ذیل الفاظ میں ما بہ الامتیاز کیا ہوگا ؟

خداوند، خاوند، نہاوند، ہاون، الکیاون، باون، ستاون، اٹھاون، مہاوت، لگاوٹ، ملاوٹ، دساور، ڈاور، آژن ہاور، سخاوت، شقاوت، ٹاور، پاور۔ آور نچھاور، شاور۔ تلیین کی تشریح سابقہ اوراق میں کی جاچکی ہے ۔

واوِ عطف ص۳۸

فرماتے ہیں : ۔ جب مرکب عطفی کے پہلے جز کا آخری حرف الف ، بائے مختفی ، ی ، ے یا واؤ ہو تو اکثر یہ غلطی ہو جاتی ہے کہ واؤ پر ایک عدد ہمزہ کو مسلط کر دیا جاتا ہے جو بالکل فالتو ہوتا ہے اور اس طرح املا غلط ہو جاتا ہے ۔ دنیا و دین ، جلوہ و پردہ ، جستجو و تلاش ، زندگی و موت مے و جام وغیرہ ۔ خلاصہ یہ کہ مرکب عطفی میں واو پر یا واو سے پہلے والے حرف پر ہمزہ کہیں نہیں آئے گا ۔

عرض ہے کہ واو عاطفہ دراصل مفتوح ہے۔ عربی سے فارسی میں پھر اُردو میں آیا۔ اُردو ادب میں مفتوح تو شاید ضرورت شعری سے کبھی کہیں بھولے سے ہی استعمال ہوا ہوگا۔ عرائض نویسوں اور منشیوں کی زبان سے کبھی کبھی، دال وَ چاول، میدہ وَ آٹا، میز وَ کرسی، سُن کر و سمجھ کر وغیرہ سُننے اور دیکھنے میں آجاتا ہے۔ فارسی میں بھی واو عطف مفتوح بہت کم استعمال ہوا ہے۔ اس وقت اس کی ایک مثال سامنے ہے۔ مگر یہ واؤ بھی دو جملوں کے بیچ میں ہے۔ (عمر خیام)

آنہا کہ محیطِ فضل و آداب شدند　　در کشفِ علوم شمعِ اصحاب شدند
رہ زیں شبِ تاریک نبردند بروں　　گفتند فسانۂ، وَ در خواب شدند

اس کے استعمال کے دو طریقے ہیں۔ مکتوب غیر ملفوظ ماقبل مضموم۔ جیسے

زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے　　کشاد و بست مژہ سیلیٔ ندامت ہے

کشاد کی دال مضموم ہے واؤ معطل ہے لیکن کتابت میں موجود رہے گا۔ واؤ معدولہ کہہ کر اس پر ہاتھ صاف نہیں کیا جائیگا۔ یہ واؤ تقطیع میں نہیں آئے گا۔

دوسرا طریقہ، مکتوب ملفوظ ساکن ماقبل مضموم۔ جیسے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے　　ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

شب کی "ب" مضموم، واؤ ساکن ملفوظ۔ یہ واؤ تقطیع میں آئے گا۔ واؤ عاطفہ کا ماقبل ہمیشہ مضموم ہوتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہائے مختفی والے الفاظ میں مضموم اس کا ماقبل ہوگا یا خود واؤ متحرک ہوگا؟ بندہ و خواجہ کو کس طرح پڑھیں گے؟ (بَ نْ دَ ہُ) یا (بَ نْ دَ ہْ وُ) یا (بَ نْ دَ ہْ وَ) اور ترکیب اضافی میں کیا کریں گے؟ کیا ہائے مختفی کے نیچے زیر آئیگا؟ (بَ نْ دَ ہِ)

ہائے مختفی کبھی متحرک نہیں ہوتی اس لئے تلفظ اس کا مبدل بہمزہ ہو جاتا ہے لیکن لفظ کی ہیئت کو کتابت میں قائم رکھا جاتا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟ ہمزہ لکھنے سے آپکو چڑ ہے تو اور کوئی ترکیب بتائیے جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ ہائے ہوز کا تلفظ بدل گیا ہے۔ شاید آپ کہیں گے کہ ہائے مختفی کا تلفظ ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو حرکت ماقبل کو سہارا دینے کے لئے آتی ہے تو فرمائیے عطف میں ضمہ اور اضافت میں کسرہ کونسے حرف پر آئیگا؟

اب لیجیے الف والے الفاظ جزا و سزا، اخفاو اظہار وغیرہ ان میں کیا واو عاطفہ مفتوح کیا جائے گا؟ اگر نہیں تو کیا واو کا ماقبل مضموم ہوگا؟ اور اضافت میں مکسور کونسا حرف ہوگا؟ کوئی ایسی ترکیب بتائیے جو مرکب عطفی، مرکب اضافی، مرکب توصیفی وغیرہ سب میں کام آئے۔ اگر الگ الگ نسخے تجویز کیے گئے یا الگ الگ کلیے بنائے گئے تو مزید انتشار کا سبب ہوگا۔

بیشک واو عاطفہ کا ماقبل اگر یائے تحتانی (جزو لفظ) ہے تو واو عاطفہ پر یا "ی" پر اور اضافت میں بھی "ی" پر ہمزہ نہیں لکھنا چاہیے۔ خود "ی" کبھی بہ تخفیف کبھی بہ تشدید مضموم و مکسور ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جیسے خودیؔ و بیخودی۔ بندگیِ خدا، کج ادائیِ دوست، وغیرہ (ذوق)؎

کیا مجنوں مجھے آشفتگیِ زلف نے کس کی

کہ میرے سر پہ مرغ شانہ سر نے آشیاں باندھا

یادش بخیر! استاد مرحوم حضرت سائل دہلوی کا فرمودہ یاد آگیا۔ میں نے دریافت کیا تھا کہ مے ناب، نای و نوش، نے و بربط وغیرہ الفاظ کو کس طرح لکھا اور پڑھا جائیگا؟ فرمایا کہ صاف اور واضح طور پر (ی) کا تلفظ ہوگا۔ جو لوگ ہمزہ پڑھتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں۔ ہر ایک ترکیب میں (ی) متحرک ہوگی۔ فرمایا دیکھو مثنوی مولانا رومی کا مصرع ہے "کز نیستاں چوں مرا ببریدہ اند۔ اس میں (ی) متحرک ہے نا؟ ص۳۸۲ پر مصنف کی دی ہوئی مثال — شمع و گل تا کے و پروانہ و بلبل تا چند۔ اس کی تائید کرتی ہے۔

جن الفاظ میں واو عطف سے پہلے واو ماقبل مضموم ہے ان میں کوشش کی جاتی ہے کہ واو کو مضموم نہ کیا جائے کیونکہ واو پر ضمہ ثقیل ہوتا ہے۔ اگر مادہ میں (ی) موجود ہے تو اس کو واپس لے آتے ہیں جیسے جستجوی و تلاش نہ ہو تو اضافہ کر دیتے ہیں۔ جیسے آرزوی و تمنا۔ یہاں پھر "ی" کی تلیین کے لئے "ی" پر ہمزہ آئے گا۔

بعض الفاظ میں یا تو غیر فارسی الاصل ہونے کی وجہ سے یا واو کا ماقبل ساکن ہونے کی وجہ سے واو مادہ خود متحرک ہوجاتا ہے۔ جیسے نشو و نما، ہندو و مسلم، دیو و دد غدیو و کسریٰ۔

خلاصہ یہ کہ واو والے الفاظ میں (ی) کا اضافہ ہو تو مرکب عطفی میں اور اضافت میں (ی) پر ہمزہ لکھا جاتا ہے جیسے جستجوئے دوست، آرزوئے مسرت، ابروئی و مژگاں جستجوئی و تلاش، اس میں بھی ضرورت شعری سے اگر واو کو متحرک کر دیا جائے تو (ے) پر ہمزہ نہیں لکھا جائیگا۔

خال عارض ہے جو ہندوئے خدا ترس تو کیا (ذوق) ہم سیہ بختوں کے حق میں تو ہے قصاب بنا

فاضل مصنف نے مثال کے طور پر چند شعر نقل کیے ہیں۔ ان میں انشا کے مندرجۂ ذیل شعر میں ابرو کا املا بغیر (ی) کے ہے جو غلط ہے۔ صحیح یوں ہے۔

(کلیات انشا نولکشور کانپور ۱۸۹۴ء)

ہیں ترے ابروئی و مژگان و نگاہ و چشم آہ　　　طائرِ دل کو کمان و ناوک و تیر و قفس

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ فاضل مصنف نے ہمزہ وغیرہ کے متعلق اب جو قاعدے اختراع کیے ہیں، متقدمین تو ان قاعدوں کے پابند نہیں تھے اور سند میں متقدمین ہی کے اشعار اپنے اختراعی املا کے مطابق لکھ کر پیش کیے جا رہے ہیں —

شریک مشورۂ کارخانۂ عالم　　　کیا ہے تجھکو قضاؤ قدر نے تیرے مغیر

میر تقی کے اسی قصیدے کے آخر میں شعر ہے —

وہ آستاں کہ گداؤ غنی کا ہے مسجود　　　بقیہ عمر کرے صرف اس پہ بھی یہ فقیر

اس میں گداؤ غنی کی ترکیب میں واؤ پر ہمزہ لگا ہوا ہے۔

کہ چمن زار دست و دل کی سیر　　　ہیں نہاں آج آشنا و غیر

کلیاتِ میر میں یہ شعر یوں ہے :—

کہ چمن زار دست و دل کی سیر　　　ہیں نہال آج آشناؤ غیر

یعنی آشناؤ غیر کی ترکیب میں واؤ پر ہمزہ ہے۔ اور لفظ نہاں کے بجائے نہال ہے اور یہی صحیح ہے (کلیات میر مطبوعہ نولکشور کانپور ۱۸۹۲ء) ص ۵۶۴

سہارا ص ۳۸۸

لکھتے ہیں :— ہمزہ کو علامت اضافت کے طور پر صرف ایک صورت میں استعمال کیا جائیگا۔ جبکہ لفظ کے آخر میں ہائے مختفی ہو۔ اضافت کی صورت میں ہائے مختفی کے ماقبل کو سہارے کی ضرورت باقی نہیں

رہتی - چونکہ ہائے مختفی علامت کے طور پر زیر کو قبول نہیں کرتی، اس
لئے تلفظاً مبدل بہمزہ ہو جاتی ہے۔ اور مرکب عطفی میں واؤ سے
پہلے ہائے مختفی ہو تو اس پر ہمزہ ہرگز نہیں آئے گا۔
زیر کو تو قبول نہیں کرتی لیکن کیا مرکب عطفی میں ضمہ کو قبول کر لیتی ہے؟ مرکب
اضافی اور مرکب عطفی کی تقطیع میں آپ ہائے مختفی کو متحرک مانیں گے یا ہمزہ کو؟ اور
واوِ عطف کا کیا رول ہوگا؟

مفتوح یا مضموم ص ۳۹۰

کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کرلو تیر کو

یہاں آکر یہ کھلا کہ اپنے اختراعی قاعدے کو ثابت کرنے کے لئے آپ نے ایک
مفروضہ بھی ایجاد کر ڈالا۔ بنائے فاسد علی الفاسد اسی کو کہتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"واوِ عطف دونوں صورتوں میں یعنی وہ مفتوح ہو یا مضموم اظہار
حرکت کے لئے اس کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

آپ کا نظریہ ہے کہ واوِ عطف خود مضموم ہوتا ہے اس کا ماقبل مضموم نہیں ہوتا۔
اس اختراعی اصول کے مطابق مندرجۂ ذیل مصرعوں کی تقطیع فرمایئے۔ حروف کے تلفظ
و حذف اور حرکت و سکون کی جانچ کے لئے اس سے بہتر اور کوئی میزان نہیں ــــ

وہ چپ ہے جو ہوتا تھا نہ دار و رسن خاموش

اگر کمبل سے بہتر جانتے کمخواب و شبنم کو — یگانے زندگی تک ہیں عزیز و اقربائے رند
حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا — جب تک ہے جہاں میں گل و گلزار

(بحر الفصاحت ص ۱۸۱ تا ص ۱۹۱)

سادہ و پرکار تر غافل و ہشیار تر (غالب نسخۂ عرشی)
شیشہ و شمع ہی نمایاں ہے (میر مرثیہ آسی)

خلق کریم و نفس نفیس و ابر مفیض و فائز رحمت
آب بقاؤ خاک شفاؤ نار خلیل و باد مسیحا (ذوق)

چاہنا خلق کو صہباؤ صنم سے محروم — ایسی نیت پہ بہشت آپ کو واعظ معلوم (مومن)

یائے مکسور کا تلفظ ص ۱۰۴

لکھتے ہیں :— اس بات کو خاص طور پر ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جن لفظوں کے آخر میں "ی" یا "ے" ہو، خواہ اصلی یعنی جزو لفظ ہو خواہ اضافی ہو، اضافت کی صورت میں وہ "ی" مکسور ہو جائیگی۔ اس پر ہمزہ ہرگز نہیں لکھا جائیگا۔ مثلاً مبتلائے غم، رعنائی خیال یا مرضیٔ خدا یا زندگیٔ عیش لکھنا غلط ہو گا۔ کیونکہ یہاں ہمزہ فالتو ہی نہیں غلط بھی ہے۔ ایک آواز کے لئے دو حرف یکجا نہیں کیے جائیں گے۔ صحیح املا مرضیِ خدا، مبتلاے غم، زندگیِ عیش، رعنائیِ خیال، ہوگا۔ ایسے مقامات پر "ی" پر ہمزہ لکھنا غالب کے الفاظ میں عقل کو گالی دینا ہے۔

غالب نے تفتہ کو لکھا تھا :—

"دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو۔۔۔۔۔ غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے؟ یاد رکھو یائے تحتانی تین طرح پر ہے۔ جزو کلمہ (مصرع) ہمای برسر مرغاں ازاں شرف دارد۔ (مصرع) اے سر نامہ نام تو عقل گرہ کشای را۔ یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یائے تحتانی ہے جزو کلمہ ہے۔ اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔ دوسری تحتانیِ مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے۔ ہمزہ وہاں بھی مخل ہے۔ جیسے آسیای چرخ یا آشنائے قدیم — توصیفی، اضافی، بیانی کسی طرح کا کسرہ ہو ہمزہ نہیں چاہتا۔ فدای تو شوم، رہنماے تو شوم، یہ بھی اسی قبیل سے ہے"۔

مرزا غالب کے مندرجۂ بالا ارشاد پر فاضل مصنف نے غور نہیں کیا۔ اپنی تائید میں تصوّر کرکے اس کو یہاں نقل کر لیا۔ حالانکہ وہ فاضل مصنف کے نظریات کے مخالف ہے۔ غالب پر فارسیت غالب ہے اس لئے وہ ہندوستان کے جمہور اُدبا و علماء کی پیروی کو غلطی قرار دیتے ہیں۔ مگر ہمزہ لکھنے کو جمہور کا اختیار کیا ہوا املا ضرور تسلیم کرتے ہیں۔ انھوں نے غور نہیں کیا کہ "ی" کا تلفظ جس طرح عرب اور ایرانی کر سکتے ہیں ہم ہندوستانی نہیں کر سکتے۔ اور ہم تو خدا کے کلام میں بھی بہت سے حروف کو ان کے صحیح مخارج سے ادا نہیں کر سکتے۔

اگر خدا نے اس کی حفاظت کا اعلان نہ فرمایا ہوتا تو یار لوگ اس میں سے بھی بہت سے حروف کو مردہ لاشیں قرار دیکر خارج کر دیتے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں فرماتے ہیں :-

معمتوں کے سلسلے میں ان زائد حروف کا ذکر بھی ضروری ہے جو عربی سے لیے گئے ہیں۔ اور جو ہمارے حروف تہجی اور نظام درس کے لئے پیرِ تسمہ پا بنے ہوئے ہیں۔ میری مراد، ذ، ض، ظ، ط، ث، ص، ح وغیرہ سے ہے۔ صوتی نقطۂ نظر سے یہ سب مردہ لاشیں ہیں جنھیں اُردو رسم خط اُٹھائے ہوئے ہے۔ صرف اس لئے کہ ہمارا رشتہ عربی سے ثابت رہے۔ (اردو صوتیات کا خاکہ، رسالہ اردوئے معلی، لسانیات نمبر ا
اُردو املا ص ۳۱۹

خدا نے حکم دیا ہے کہ قرآن کے حروف کو حتی الامکان صحت مخارج کے ساتھ پڑھو۔ کوشش کے باوجود نہ ہو سکے تو وہ معاف فرمانے والا ہے۔ لیکن ہماری روزمرہ کی بول چال میں سوسائٹی ہمیں معاف نہیں کر سکتی۔ متقدمین نے دیکھا کہ ہم آشنائے قدیم کی ترکیب میں "ی" کا پورا تلفظ نہیں کر سکتے۔ ہماری زبان پر اس کا تلفظ بہت ڈھیلا ہے اس کی نشاندہی کے لئے ہمزہ کو استعمال کیا گیا جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔

پہلے والی مثال " ہمای اور کشای" میں ہمزہ لگانا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔ اس کا تو ہمارے زیرِ بحث مرکب اضافی و توصیفی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ فارسی مصرعے ہیں۔ ان میں واقعی ہمزہ نہیں آنا چاہیے۔ اور اگر اردو میں بھی ہمای اور کشای بروزن فعول اسی طرح بلا اضافت آئے جس طرح ان فارسی مصرعوں میں ہے تو بیشک " ی" پر ہمزہ لگانا عقل کو گالی دینا ہوگا۔ جیسے " یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جاے ہے"۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ یہ الفاظ اب اس طرح استعمال ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔

خلاصہ یہ کہ جمہور کے خلاف مرزا غالب کا ذہن محض غلبۂ مذاق فارسیت کی وجہ سے ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم سے نہ ہو سکے جب بھی ہم اس پر عمل کریں۔ یعنی تلفظ تو ہم اپنا نہ بدل سکیں مگر ایرانیوں کی تقلید میں املا کو بدلنا ضروری قرار دیں۔ ایک آواز کے لئے دو حرف یکجا نہیں کیے جائیں گے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن دو حرفوں کو جمع کیے بغیر اُس ایک آواز کی نشاندہی نہیں ہو سکتی جو در حقیقت وجود میں آ چکی ہے۔ ہائے مخلوط والے حروف کیا ہیں؟

اہلِ اردو یائین کے اجتماع سے بھی گھبراتے ہیں جبکہ پہلی یا مکسور ہو۔ جہاں ایسا موقع آتا ہے فوراً پہلی یا کو ہمزہ سے بدل دیتے ہیں۔ خود فاضل مصنف نے بھی ایسا کہا ہے:۔

ان مصدروں میں ی اور ہمزہ کا اجتماع مان لیا جائیگا۔ تخئیل تزئین، تذئیل، تمئیز، تغئیر۔ اور دو مصدر پرانے املا کے مطابق لکھے جائیں گے۔ تعیین۔ تبیین۔ (اردو املا ص ۲۳۳)

سمجھیے، دیکھیے وغیرہ میں یہی عمل کیا گیا تھا۔ اور بعض الفاظ کی ہئیت وضعی کو بگاڑ دیتے ہیں۔ جیسے تمیز، تعین، تخئیل، تزئین، تغئیر وغیرہ۔ لیکن اب یا کو واپس لانے کا رجحان بڑھ چکا ہے اور کافی حد تک کامیابی ہوگئی ہے۔ میں ان مصادر میں (سے کسی میں بھی) ہمزہ نہیں لکھتا۔ دو لفظوں میں جو تبدیلی ہو چکی ہے۔ ان میں عام محاورہ کا اتباع کرنا پڑتا ہے۔ بدتمیز باتمیز اور تعینات۔ لیکن ترکیب میں جبکہ معنی مصدری مراد ہوں تو تعیین رنگ و نسل، تمیز نیک و بد۔ بیائین لکھنا چاہیے۔ اردو افعال میں بھی نقطے لکھتا ہوں۔ لئے بمعنی واسطے (حرف جار) میں ہمزہ لگاتا ہوں۔ ایک استثنا پہلے سے چلا آرہا ہے وہ یہ کہ سمجھیے، دیکھیے، جیسے، کیے، پیے کی طرح دینا کا فعل دیے ہونا چاہیے۔ مگر اس کو باضافۂ شوشہ و ہمزہ (دیئے) لکھا جاتا ہے تاکہ دیا بمعنی چراغ کی جمع دیے سے التباس نہ ہو۔

شئے لطیف ص ۲۰۹

لکھتے ہیں:۔ جن لفظوں کے آخر میں ے ہو اور اس کا حرف ماقبل مفتوح ہو جیسے مے، شے۔ ایسی ے پر اضافت کا زیر لگایا جائیگا۔ جیسے مےِ صاف، شےِ لطیف۔

فاضل مصنف کو لفظ شے میں غلط فہمی ہوئی۔ اس کا تلفظ ہمزہ کے ساتھ ہے۔ شےءِ لطیف۔ یہ لفظ مہموز اللام ہے۔ ہمزہ مادہ کا حرف ہے یہ حذف نہیں ہوسکتا۔ اِنَّ اللّٰہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ ایسے دو حرفی الفاظ اگر عربی کے ہوں تو ان کے حروف اصلیہ کو ملحوظ رکھا جائیگا۔ جیسے شیءِ لطیف، قےءِ خون، طےِ منازل، حےّ و قیوم، حےِ قدیر، غےّ و ضلال، فےءِ زوال۔

اور اگر فارسی کے ہوں تو ے کے نیچے زیر ہوگا اور تلفظ بھی ے کا صاف طور پر ہوگا۔ جیسے مےِ ناب، نیستان، نےِ و بربط، کےِ و جم۔ لیکن لیے جو اردو میں واسطے اور

لئے کے معنی میں آتا ہے وہ مستثنیٰ ہوگا۔ اس کا تلفظ بھی ہمزہ سے ہوگا اور لکھا بھی ہمزہ جائیگا۔

اپنے جلسوں میں جلاتے ہیں مجھے میرے حبیب　　میں ہوں اک شمع پئے محفلِ احباب بنا (ذوق)

بلکہ اس کا املا باضافۂ شوشہ بھی ہے۔

پئے ناواقف رہ پہلے ہے رہبر موجود　　گو رہے آگے قدم دیکھ عصا نے رکھا (ذوق)

میرے خیال میں دیوان ذوق میں املا برعکس ہوگیا۔ پہلے شعر میں پئے اور دوسرے میں پۓ ہونا چاہیے۔ اس استثنا سے گھبرائیے گا نہیں۔ ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔

اس طرح کے کچھ نہ کچھ اختلافات ہمیشہ رہیں گے۔ ان سے الجھنا نہیں چاہیے۔ ان کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ اور یہ بات سیاق عبارت سے معلوم ہوتی ہے کہ کہاں پر کس صورت کو رکھا جائے۔ زبان میں مکمل یکسانیت کی امید رکھنا نہ مناسب ہے نہ ممکن۔ (اردو املا ص۴۲۷)

یعنی کتنے ہی کلیے مال غنیمت کی طرح ہاتھ لگتے رہیں مگر استثنا ضرور ہوگا۔ اسی فعل کا ارتکاب متقدمین نے کیا تھا مگر اب وہ سیئات میں شمار ہونے لگا۔

کسرۂ اضافت کی کشش ص۴۱۳

لکھتے ہیں:۔ شاعری میں جہاں اور بہت سی آزادیاں روا رکھی گئی ہیں، اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اضافت کے زیر کو اس حد تک کھینچا جاسکتا ہے کہ ایک حرف کے اضافے کا فائدہ حاصل ہوجائے۔ مگر آواز کی یہ کشش صرف پڑھنے میں آتی ہے۔ لکھنے میں اس کا کچھ اثر ظاہر نہیں ہوتا جیسے یہ مصرع —

تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

اس مصرع میں دو جگہ یہ صورت واقع ہوئی ہے۔ تقطیع میں بردن کو بردنے فرض کرلیا جائے گا۔ اسی طرح تماشائے میں ایک کی جگہ دو "یے" مان لی جائیں گی۔ مگر اس سے املا پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اس میں اتنا اور اضافہ فرما دیتے تو اچھا ہوتا کہ مرکب عطفی میں کبھی واو عطف کو تلفظ میں سے غائب بھی کردیا جاتا ہے۔ بس اس کے ماقبل کا ضمہ باقی رہتا ہے۔ جیسے۔

کشادُ بستِ مژہ سیلیِ ندامت ہے

کس قدر اہم مسئلہ فلسفۂ و منطق کا حل ہوا ہے! تقطیع میں بردن کو بردنے فرض کر لیا جائے گا۔ تماشائے میں ایک کی جگہ دو "یے" مان لی جائیں گی۔

فرض تو کیا جاتا ہے شئی موہوم و معدوم کو جس کا خارج میں وجود نہ ہو اور آپ خود اپنی زبان سے ایک زائد (ے) کا تلفظ بھی فرماتے ہیں اور اس کو ایک حرف کے اضافہ کا فائدہ بھی قرار دیتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ فرض کر لی گئی ہے۔ دو "یے" کا وجود نہیں ہے۔ مگر فرض کر لی جائیں گی، مان لی جائیں گی۔ تو جب ایک فرضی چیز کو ماننا ہی ٹھہرا تو دو "یے" میں سے ایک کو ہمزہ ہی کیوں نہ مان لیا جائے؟

یہاں ایک نیا قاعدہ ہاتھ آیا کہ علم اللسان کی بنیاد مفروضات پر بھی رکھی جا سکتی ہے۔

اعداد استغراقی ص ۴۴۷

لکھتے ہیں:۔ عدد استغراقی کے بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ عدد معین کے آگے (وں) بڑھا دیتے ہیں جیسے چاروں، پانچوں وغیرہ۔ صرف "دونوں" مستثنا حیثیت رکھتا ہے۔ اس قاعدے کی رو سے زیر بحث اعداد کی صورت بارہوں، تیرہوں وغیرہ ہونا چاہیے۔ پرانے شاعروں نے ان کو اس طرح استعمال بھی کیا ہے۔

تو بھی حیدر کی ثنا کر نہ سکیں کچھ، گو ہوں
بارہوں برج یہ اور آٹھ پہر بیسوں ایک (انشا)

مگر اب استعمال عام میں یہ عدد استغراقی بھی بجائے مخلوط آتے ہیں بول چال میں بھی اور تحریر میں بھی۔ اس لئے اب ان اعداد کو بجائے مخلوط مرجح قرار دیا جائے گا۔ اس طرح۔ گیارھوں بارھوں وغیرہ

واضح ہو کہ عدد استغراقی کے لئے (وں) کا استعمال صرف چھ اعداد میں ہے۔ وہ یہ ہیں۔ دونوں، تینوں، چاروں، پانچوں، ساتوں، آٹھوں۔ ان کے علاوہ (وں) کہیں نہیں۔ بلکہ چھ کے چھ، نو کے نو، دس کے دس، گیارہ کے گیارہ۔ اسی طرح آخر تک عدد استغراقی بنے گا۔

چھیوں، دسوں، گیارہوں، بارہوں، بیسوں، تیسوں وغیرہ غرضکہ مذکورۂ

بالا چھ اکائیوں کے علاوہ سب متروک اور غیر فصیح ہیں۔

اظہار کثرت کے لئے جو (وں) لگتا ہے وہ بھی چند اعداد میں لگتا ہے اور وہ یہ ہیں:۔ بیسیوں، سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، اربوں، کھربوں۔ اس سے آگے استعمال میں نہیں آتا۔ یہ (وں) دہائیوں میں سے صرف بیس میں آتا ہے۔ وہ بھی ایک یائے معروف کا اضافہ کر کے۔ بیسیوں اور پھر سیکڑوں۔ اور دسوں، بیسوں، تیسوں وغیرہ استغراق کے لئے بھی غیر فصیح اور اظہار کثرت کے لئے بھی غیر فصیح اور دسیوں تو نہایت گھٹیا اور غلط ہے۔

چھہتر ص ۴۵۲

لکھتے ہیں، چھیتر کو نور و آصفیہ میں چھہتر لکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ چھ کا املا چھہُ یا چھ قرار دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ چھ سے چھیوں اور چھہتر بننا چاہیے۔ مگر جیسا کہ لفظ چھے میں بہ تفصیل مذکور ہوگا اس لفظ کا مرجح املا چھے ہے۔ اور اس لحاظ سے چھیوں اور چھیتر صحیح املا مانا جائیگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ چھیالیس چھیاسٹھ، چھیانوے سب میں چھ کے بعد ی ہے۔ اور یہ بڑی دلیل ہے چھیتر کے صحیح ہونے کی۔ ہاں یہ کہہ دیا جائے کہ چھیالیس چھیاسٹھ چھیتر، چھیاسی، چھیانوے۔ ان سب اعداد میں ی کی حیثیت تلفظ کے لحاظ سے یائے مخلوط کی سی ہے۔

عرض ہے کہ اس کی وجہ جو آپ کی سمجھ میں آئی ہے ممکن ہے وہی ہو۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ لفظ ستر دراصل ہتر تھا۔ ہائے ہوز کو سین سے تبدیل کیا گیا ہے۔ اور یہ تبادلہ بہت سے الفاظ میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً پنجاب کے ایک قصبے میں ایک شخص گنے بیچ رہا تھا۔ میں نے خود اس کو آواز لگاتے ہوئے دیکھا۔ گنا پیہے پیہے گنا پیہے پیہے۔ یعنی پیسے پیسے۔ گجرات میں ایک قصبہ ہے پلسانہ اس کو وہاں کے لوگ پہانہ بھی کہتے ہیں۔ اور لفظ دس میں بھی یہ تبادلہ ہوا ہے، فارسی میں دہ ہے۔ اردو میں دہائی میں ہائے ہوز موجود ہے۔ پنجاہ میں آخری حرف ہ ہے، اردو میں پنجاس پھر پچاس بنا۔ اب دیکھیے ستر والے اعداد۔ ایک اون ہتر (اون کے معنی کم) یعنی ایک کم ستر

(اونہتر) — ایک ہتر، اکہتر۔ بَے ہتر، (بَے کے معنی دو، گجرات میں بولا جاتا ہے۔
بَے بَے آنے یعنی دو دو آنے، یہ آواز خود سُنی ہے)، یہی بَے، بارہ بائیس تیئس،
بیالیس باون باسٹھ بہتر بیاسی بانوے میں ہے۔ تے ہتر، تہتر۔ چوہتر، پنچ ہتر، پچ
ہتر، پچہتر۔ چھ ہتر، چھہتر۔ سات ہتر، ست ہتر۔ آٹھ ہتر، اٹھتر۔ ایک اون اسی،
اُناسی۔ مولوی عبدالحق نے قواعد اردو میں گنتی کا تجزیہ کیا ہے۔

واضح ہو کہ چھ کا تلفظ دہلی میں بالفتح بروزن حَے ہے۔ یہ لفظ مرکب نہیں ہے،
تنہا ایک حرفِ مفرد ہے۔ چھاہی، چھدام اور چھہتر میں یہ مفرد ہی ہے۔ اور اگر مرکب
مانا جائے تو اس کی اصل چھچھ ہوگی (یعنی مکرر چھ) شش کا تبدیل شدہ تلفظ۔ کیونکہ
سنسکرت میں شش چھ کا تبادلہ ہے۔ دوسرے چھ کو ہائے ہوز سے بدلا تو چھہ رہا۔ اور
ہندی میں شٹ ہے۔ اور دوسرا تلفظ کھٹ بھی ہے۔ اسی سے چھٹا ہوگیا۔ لہذا اس کا
املا بہائے مختفی تو درست ہوسکتا ہے۔ بیائے مجہول غلط ہوگا۔

چھیتر میں "ی" کے تلفظ کو آپ نے یائے مخلوط نہیں بلکہ اس کے مشابہ قرار دیا
ہے۔ اور واقعی اس کا تلفظ ڈھیلا ہے۔ اور اس کے ڈھیلے پن کو ظاہر کرنے کے
لئے آپ نے کوئی نشانی مقرر نہیں کی۔ اگر میں کہہ دوں کہ اس ی پر ہمزہ لگاتے ہیں
اور مناسب بھی ہے تو آپ روٹھ جائیں گے۔ مناسب اس لئے ہے کہ ہندی میں چھیتر
(چھے تر) بمعنی رقبہ ہے اس سے امتیاز رہے گا۔ اور روٹھنے کا کام کیا ہی کیوں جائے؟
صحیح املا چھہتر ہی مان لیا جائے۔

چھیوں اور چھہوں میں وجہ ترجیح تو جب تلاش کی جائے کہ یہ کوئی عدد
استغراقی ہو بھی؟ سماعی مرکبات میں قاعدے نہیں چلا کرتے۔ مثلاً اجاڑو کمارو،
بگاڑو کھورو کھسوٹو (اسم مبالغہ) کے قیاس پر پونچھو پوچھو پہنو بھاڑو چلو (بواؤ
معروف) نہیں بن سکتے۔ خرچیلا بھڑکیلا رنگیلا کے قیاس پر لٹکیلا رگڑیلا جھٹکیلا وغیرہ
نہیں بنیں گے۔ بناوٹ لگاوٹ گراوٹ کے قیاس پر جماوٹ لکھاوٹ ڈراوٹ اتراوٹ
چڑھاوٹ نہیں بن سکتے۔

اسی طرح فارسی میں بھی ہے۔ دانا گویا شناسا کے قیاس پر نویسا زنا ردا
خسپا کنا کوشا نہیں بنائے جاسکتے۔ اور یہ تو فرمائیے نو کے عدد کو تو آپ نے چھوا تک نہیں۔

اس کا عدد استغراقی کیونکر بنے گا ؟

بچپاسی پچپانوے ص۴۵۶

لکھتے ہیں :۔۔ بعض ایسی گنتیاں جن میں ی شامل نہیں ان کو خواہ مخواہ باضافۂ یا لکھ دیا جاتا ہے جیسے بچپاسی ، پچپانوے ، ننیانوے ۔
ان کا صحیح املا بغیری کے ہے ۔ بچّاسی ، پچانوے ، ننانوے ۔

واضح ہو کہ اول الذکر دو اعداد کا صحیح املا ی کے ساتھ ہے ۔ یعنی بکسر اول ، چ مشدد بیائے مخلوط ۔ ننانوے میں ی نہیں ہے ۔ اہل دہلی اسی طرح بولتے ہیں ۔ آصفیہ نے تینوں اعداد کو فصحائے دہلی کے مروجہ لہجے کے مطابق لکھا ہے ۔

غلو ص۴۶۲

لکھتے ہیں :۔۔ انجمن ترقی اردو نے اصلاحات املا کے تحت جو تجویزیں منظور کی تھیں ان میں سے ایک تجویز یہ بھی تھی کہ دو لفظوں کو ملا کر نہ لکھا جائے ۔ تجویز یہ تھی :۔

مرکب لفظ جو دو یا دو سے زیادہ لفظوں سے بنے ہوں آپس میں ملا کر نہ لکھے جاریں ۔ بل کہ ہمیشہ الگ الگ لکھے جاریں ۔ البتہ ان کے درمیان فاصلہ صرف اُتنا ہو جتنا ایک ہی لفظ کے دو ٹکڑوں کے بیچ میں ۔ جیسا کہ ان مثالوں سے واضح ہوگا ۔ جیسے آج کل ، بن مانس ، بن ڈُبی ، کل جگ ، کَل مُنہا ، کل دار ، شاہ نامہ ، شاہ جہاں آباد ، شاہ جہاں پور ، جے پور ، اودے پور ، فرخ نگر ، ناگ پور کان پور ، دل لگی ، گل کاری ، پھُول کاری ۔ بعضے مفرد لفظ دو طرح لکھے جاتے ہیں بی بی اور بیبی ۔ دُل دُل اور دُلدُل ۔ ان کی منفصل لکھاوٹ اختیار کی جائے ۔ اس طرح کھل بلی ، جُھٹ پٹا ، جُھن جُھنا ، کُن کنا ، ہل چل ، گُل گلا ، رس گُلّا ، لس لسا ، کھٹ کھٹانا ، کھن کھنانا کھٹ کھٹاہٹ ، کھن کھناہٹ ، دانتا کل کل ، جھن جھٹ ۔ فارسی لفظ بہ نہ چہ کہ بے وغیرہ جو خود فارسی میں بھی کبھی دوسرے لفظ سے ملا کر اور کبھی الگ لکھے جاتے ہیں ۔ اردو عبارت میں الگ لکھے جاریں ۔

جیسے بہ خوبی ، بہ ہر حال ، بہ کمال شفقت ، بہ دولت ، نہ خورد، چہ کنم، نہ گفت، چہ می گوئی ، چہ می گوءیاں، حال آں کہ، بل کہ ، چوں کہ ، چناں چہ ،غرض کہ تا وقتے کہ ، بہ شرطے کہ ، بے شک ، بے تحاشا، بے محابا وغیرہ ۔ (روداد کمیٹی اصلاح رسم خط۔ اُردو، جنوری ۱۹۴۲ء)

آگے لکھتے ہیں :۔

فارسی کی تقلید میں اردو میں بھی لفظوں کو ملا کر لکھنا وبائے عام کی طرح پھیل گیا۔ بل کہ ہمارے زمانے کے بعض حضرات تو اس قدر غلو کرتے ہیں کہ چلیگا ، لکھینگے اور اُٹھینگی وغیرہ لکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی ـــ اردو رسم الخط اور املا کے ان ائمہ مجتہدین نے اردو کو ایسی ایسی پٹخنیاں دی ہیں کہ الامان والحفیظ ۔ مگر یہ سخت جان اردو نہ صرف ان تھپیڑوں میں زندہ ہے بلکہ ساری دنیا میں اس کا پرچم لہرا رہا ہے۔ مندرجہ بالا عبارت میں ایک عجیب وغریب املا نظر آیا۔ جاریں ، چہ می گوریاں ، تعجب ہے ، چہ می گوریاں اور جاریں میں تو ہمزہ الگ ہو گیا اور ی کا شوشہ حذف ہو گیا اور چہ می گوئی میں ی کا شوشہ اور اس پر ہمزہ موجود ہے ۔ حالانکہ اس کو چہ می گوءی لکھنا چاہیے تھا۔ شاید یہ چوک کاتب سے ہو گئی ہو ۔

غلو اور افراط وتفریط دونوں طرف ہے۔ اگر ایک طرف یہ ہے : ۔

ایکطرف ، ضرورتکے موافق ،ضلعمرادآباد ،ضلعبدایوں ، رامنگر، ڈاکخرچ ،خرچڈاک وغیرہ ۔ تو دوسری طرف یہ ہے :ـــ دُل دُل ،بل کہ ، بے گار ، بے زار ، بے دار ، بے داد ، پے زار ، بے رونی ، بے طار ، بے وَہ ، بے ہودہ ، بے سن ، بے لن ، بے ٹھن، بے ٹھک ، مَے کا ، نل کی ، خان قاہ ، مہ مان ، کون سا ، وغیرہ

نون نفی ، یائے جارہ ، اور چہ میں ہائے مختفی نہیں تھی ۔ علیحدہ لکھنے میں وہ صرف سرحرف تھا۔ قلم کی روانی سے اس کے آگے خم آ گیا ۔ ہائے مختفی بن گئی ۔ اگر ہم بخوبی ، بہرحال ، بدولت ، نگفت ، حالانکہ ، لکھیں تو وقت کی بھی بچت ہے اور قلم کا سفر بھی مختصر ہوتا ہے ۔ ایک ناخواندہ مہمان سے بھی نجات مل گئی ۔ تحریر میں جگہ بھی کم خرچ ہوئی ۔ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ دو حرفوں کو ملا کر جیسے بلکہ ، چونکہ، وغیرہ

یا اسم اور حرف کو ملا کر لکھیں جیسے غرضکہ ، بشرطیکہ ، بیشک وغیرہ تو اس میں فائدہ ہی ہے نقصان کچھ نہیں ۔ بہر حال اس افراط و تفریط سے سخت انتشار پیدا ہو گیا ہے کاتبوں کو جب یہ کلی طور پر ہدایت دی گئی تو انھوں نے مفرد الفاظ کے بھی ٹکڑے کر دیئے ۔

آگے فاضل مصنف نے ایک طویل فہرست دی ہے اُن الفاظ کی جن کو الگ الگ دو ٹکڑوں میں لکھنا چاہیے۔لیکن استثنا سے مفر نہیں ۔ پھر استثنا آن دھمکا ۔ فرماتے ہیں ۔

بے دل ، بے دم ، بے خود ، بے تاب ، بے کل ، بے نوا ، بے خبر ، بے صبر جیسے الفاظ بطور تخلص آئیں تو ملا کر لکھو ــ بیدل ، بیخود ، بینوا وغیرہ

اور لیجیئے پھر استثنا ۔ فرماتے ہیں : ـ

"بہ" خواہ کسی معنی میں آئے اس کو عموماً علاحدہ لکھا جائے گا۔

البتہ چند لفظ ایسے ہیں جو مفرد لفظ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ان کو اس قاعدے سے مستثنا سمجھا جائے گا ۔ جیسے بہم ، بغیر ، بعینہٖ ، بفضلہٖ ، بجز ، بجائے ۔

غور فرمایئے کہ اردو میں بل ، چوں ، چناں ، چہ ، آں کہ ، مفرد حیثیت سے استعمال نہیں ہوتے یعنی بلکہ سے علیحدہ صرف بل اردو میں نہیں ہے ۔ اسی طرح چوں چونکہ سے علیحدہ اردو میں نہیں ہے ۔ یہی حال چہ اور آنکہ کا ہے ۔ بلکہ ، چونکہ ، چنانچہ ، حالانکہ تو مفرد کی حیثیت اختیار نہیں کر سکے اور بہم ، غیر ، عین ، فضل ، جز ، جائے ۔ ب کے لگتے ہی مفرد کی حیثیت میں آگئے ۔

مندرجۂ ذیل الفاظ بھی مفرد کی حیثیت اختیار نہیں کر سکے ۔ان میں بھی بہ کو علیحدہ لکھا جائیگا ۔ اس حکم کو ماننا ہر ایک حامیٔ اُردو پر واجب ہے : ـ

بدستور ، بشرطیکہ ، بہرصورت ، بہرحال ، بخدا ، براہ کرم ، بخیریت ، بآسانی ، بحکم ، بخوبی ، بذاتِ خود ، بقدرِ ضرورت ، بطرزِ میر ، بطورِ خود ، بغور ، بعافیت ، بکارِ خاص ، بقول خود ، بخطِ شکست ۔ وغیرہ ۔

لکھتے ہیں کہ : ــ بیش تر ، کم تر ، خوب تر ، خوش تر ، بیش تر ـ سب میں لفظ تر کو الگ لکھو ۔ لیکن ہائے استثنا ۔ یہ پیچھا نہیں چھوڑتا ۔ فرمایا ہے کہ بہتر کو ملا کر لکھو ۔ یہ مستثنا ہے ۔ یہ ایسے مفرد لفظ کی صورت میں ڈھل چکا ہے کہ اس کو الگ کر کے لکھنا

اجنبیت کو دعوت دینا ہے۔

اب ہم جیسے کم علم لوگ پریشانی میں گرفتار ہیں کہ کہتر مہتر کو کلیے میں شامل سمجھیں یا استثنا میں۔ اس ایمرجنسی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ہماری رہنمائی فرمایئے۔

حکم دیا گیا ہے کہ جن الفاظ میں لفظ بان ہے وہ بھی جدا جدا لکھے جائیں گے۔ جیسے باغ بان، فیل بان وغیرہ۔ لیکن یاد رکھو اس میں بھی مستثنیٰ ہے۔ پاسبان کو ملا کر لکھو۔

ارشاد ہوا ہے کہ در سے مل کر جو مرکب ہوتے ہیں ان میں ور کو الگ لکھو جیسے نام ور، طالع ور، سخن ور، طاقت ور وغیرہ۔ لیکن خبردار! ان میں سے بھی دو مستثنیٰ ہیں:— جانور اور تاجور کو ملا ہوا لکھو۔ اور زیور، سیور، گھیور کے متعلق کچھ ارشاد نہیں ہوا؟ ہاں ایک بات اور یاد آئی۔ ایک صاحب اخبار میں سے کوئی مضمون پڑھ کر چند آدمیوں کو سُنا رہے تھے۔ لفظ طاقتور کو انھوں نے کانپور، رامپور کے وزن پر پڑھا۔ یہ تلفظ لغت میں آنا چاہیے یا نہیں؟

غرضکہ ایک طویل فہرست ہے اُن قانونی دفعات کی جو اس غریب اردو پر لگائی گئی ہیں یعنی ان الفاظ کی جنکو ٹکڑے ٹکڑے کرکے لکھنا ہے۔ ان میں نہ صرف مرکبات ہیں بلکہ مفردات کے بھی ٹکڑے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسے لس لسا، خش خاش، دَل دَل، دُل دُل، تَل تَل، جھن جھٹ، گُل گُلا، بُل بُلا وغیرہ

مگر مندرجۂ ذیل الفاظ پھر مستثنیٰ ہو گئے۔ ان کا خیال رکھنا لازم ہے — ان کو ملا ہوا لکھو:—

بازیچہ باغیچہ وغیرہ۔ خاکسار شرمسار وغیرہ۔ لڑکپن بچپن وغیرہ۔ افیچی دیگچی وغیرہ۔ سرگین غمگین وغیرہ۔ بزرگوار سوگوار وغیرہ۔ کرخندار، شبنم، زمیندار۔ دیکھو اے اُردو والو! خوب یاد کر لو اس اعمالنامے کو۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کوئی انتشار نہیں ہوگا۔ غریب کی جورو سب کی بھابی۔

لکھتے ہیں:— زبان صرف اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں ہی کے لئے نہیں ہوتی۔ وہ طالب علموں اور کم خواندہ لوگوں کے لئے بھی ہوتی ہے۔ ایک پڑھا لکھا آدمی "نیکبخت" کے پڑھنے میں کوئی اُلجھن محسوس

نہیں کریگا۔ مگر ابتدائی درجوں کے طلبہ اور معمولی سطح کے آدمیوں
کو اس کے لکھنے اور پڑھنے میں اُلجھن سے آنکھیں چار کرنا پڑیں گی۔

طالب علم کی حیرانی و پریشانی کی اصل وجہ یہ ہے کہ قوم کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے گھٹیا لوگ بیسک اسکولوں میں آتے ہیں جن کو پڑھانا لکھانا تو درکنار خود پڑھنا لکھنا نہیں آتا۔ وہ اپنی تہذیب اپنا کلچر اپنا اخلاق اپنی زبان اپنا لہجہ اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ تعلیم جتنی عام ہوتی جارہی ہے اتنا ہی معیار گرتا جارہا ہے اور تربیت کا تو نام ونشان بھی باقی نہیں رہا۔

حرفوں کے جوڑ ص ۱۸۷

فاضل مصنف نے ۴۳ صفحات کا ایک طویل مضمون فن خطاطی پر بھی لکھا ہے بہت عمدہ مضمون ہے اور بہت سی مفید ہدایات و معلومات پر مشتمل ہے۔ لیکن کہیں کہیں اس میں بھی مجتہدانہ نشان پائی جاتی ہے۔ بہرحال چند مقامات پر اظہارِ خیال کرتا ہوں لکھتے ہیں۔

نسخ میں ر سے پہلے ی وغیرہ کا جوڑ بہت واضح ہوتا ہے۔ جیسے
نظیر۔ مگر نستعلیق میں یہ جوڑ بالکل مختلف انداز سے لگتا ہے۔ اس
میں ی کے لئے پورا قلم لگایا جاتا ہے اور جس طرح بنتا میں ت کا پیالہ
بنتا ہے اسی طرح نظیر میں ی کے لئے ایک ابھار سا آتا ہے۔

گذارش ہے کہ نسخ میں اس جوڑ کی ایک اور صورت بھی ہے۔ نظیر۔ اس میں جوڑ (یر) کا ہے اور نظیر میں (ر) چھوٹی رے کا ہے نستعلیق میں اسی لمبی رے والی شکل کو اختیار کیا گیا ہے۔ چھوٹی رے اس میں نہیں لی گئی نستعلیق میں یہ جوڑ جس کی وضاحت آپ نے کی ہے، فن خطاطی کے مسلمہ قاعدے کے مطابق ہے اور آپ نے تسلیم کیا اور لکھا لیکن خود آپکی تصنیف "اردو املا" میں خوب دھڑلے سے اس کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ جیسا کہ اوراق گذشتہ میں عنوانِ "غفلت مجرمانہ" کے تحت واضح کرچکا ہوں۔ تغیر، چیز، پھیر، اخیر، پیروی وغیرہ اس قسم کے الفاظ کو ہر جگہ ایک باریک شوشے کے اضافے کے ساتھ لکھا ہے۔ اور خود اسی لفظ نظیر کو دیکھیے ص ۱۲۶ کا پہلا نمایاں لفظ یہی ہے۔ اس سے آگے سجدۂ سہو ادا کیا گیا ہے۔ اور جامعہ ملیہ کے کورس کی کتابوں میں تو یہ غلط املا لازمی طور پر اختیار کرلیا گیا ہے۔ تیر کو تیر، میز کو میز (وغیرہ) لکھا جاتا ہے۔ یہ ان لوگوں کا اجتہاد ہے جو فن خطاطی سے خود واقف نہیں ہیں۔

کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے ماہرانِ فن کو ہدایات دیتے رہتے ہیں۔ اور عصرِ حاضر کے کاتب کو تو اپنی مزدوری سے غرض ہے۔ مصنف نے جیسا کہہ دیا اس نے مان لیا۔ اس فن شریف کی حفاظت سے اس کو کوئی غرض نہیں۔ بس "چوں فراغت ز مفردات آمد" پر اس کا عمل ہے۔ مفردات کی تختی نکالی اور قلم دوات لے کر کسی پٹڑی یا کسی دکان کے تختے پر جا بیٹھے۔

ایک کاتب کا واقعہ یاد آیا . . . . ایک بڑا اہم اور وسیع کام کتابت کا کرانا تھا۔ چند کاتبوں کے نمونے حاصل کیے۔ ایک کا نمونہ نسبتہً بہتر ہونے کی بنا پر منتخب کیا۔ اس سے بات کی، معاملہ طے ہو گیا۔ میں نے کہا کب شروع کرو گے اس نے کہا دو تین روز میں مسودہ لے جاؤں گا۔ مگر ایک شرط ہے۔ کتاب میں اگر کہیں کسی شخص کے نام کے ساتھ لفظ مولانا آئے گا تو میں یہ لفظ اپنے قلم سے نہیں لکھوں گا، جگہ خالی چھوڑ دوں گا۔ آپ یہ لفظ کسی اور کاتب سے لکھوا لیجیے گا۔ میں نے کہا ایک لفظ کے لئے میں دوسرا کاتب ڈھونڈھتا پھروں گا؟ اور تم کیوں نہیں لکھو گے؟ کہا کہ میرا تو مولیٰ بس ایک ہی ہے اس کے علاوہ کسی کو مولیٰ نہیں مانوں گا نہ لکھونگا۔

میں نے اس کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ بھائی! مولیٰ کے تو بہت سے معنی ہیں مالک، آقا، دوست اور آزاد کردہ غلام۔ اگر کسی آدمی کو مولیٰ کہا جائے تو وہاں دوست یا محترم بزرگ کے معنی ہونگے۔ اس میں کیا خرابی ہے۔ آیات و احادیث وغیرہ سے بھی دلیلیں دیں مگر وہ نہیں مانا۔ اب دیکھیے ہزاروں روپئے کا کام چھوڑ دیا مگر اپنی بات پر اڑا رہا۔

میں اس کو اکثر دیکھتا رہتا ہوں اس کے حرکات و سکنات میں بظاہر کوئی بات پاگل پن کی نہیں پائی جاتی۔ اچھا خاصا عام آدمیوں کی طرح ہے۔ اس بات کی تہ میں کیا راز تھا۔ اس کے دل و دماغ پر کیا خاص اثر تھا۔ غرضکہ اس کا پس منظر مجھے معلوم نہیں اور میں نے کھوج لگانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ لیکن اس کے عزم راسخ پر حیرت بھی ہے اور میرے دل میں اس کی قدر بھی ہے۔

میں استادانِ فن سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس فن شریف کی حفاظت کے لئے ایسی ہی سنک یا دیوانگی کی ضرورت ہے۔ یہ کرسی نشین آئے دن ایسے ہی نت نئے شوشے چھوڑتے رہیں گے اور تم فرش نشینوں کو ایسی ہی انوکھی ہدایات دیتے رہیں گے۔ اور خود

تمھارے ہاتھ سے تمھارے فن کے اصول وضوابط کو ذبح کراتے رہیں گے۔ اگر تم مزدمندی
کے لالچ میں رہو گے تو یہ فن شریف جس کا سیکھنا شاہزادوں اور بادشاہوں پر لازم تھا۔
جس کی حفاظت شہنشاہوں کی تیغ آزما انگلیوں نے کی ہے۔ فنا ہو جائے گا۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

جب کوئی فاضل مصنف تم کو اپنا ایجاد کیا ہوا کوئی جوڑ پیوند وغیرہ لکھنے کی ہدایت
کرے جو فن خطاطی کے اصول وضوابط سے متصادم ہوتا ہو تو تم قلم اس کے ہاتھ میں
دیکر ایک سطر لکھواؤ اور اس کا جائزہ لو۔ مانا کہ وہ اپنے علم وفن میں یکتائے روزگار اور بڑا
صاحب اقتدار ہے۔ مگر تمھارے فن میں جس کے حصول میں تمھاری انگلیاں گھس گئی ہیں،
کمریں جھک گئے ہیں اور آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں مداخلت کر رہا ہے۔ یہ خود کتنے پانی
میں ہے۔

اگر یہ جرأت، دیوانگی اور بے نیازی پیدا نہیں کرو گے تو تم اس فن کی حفاظت
نہیں کر سکتے۔ میرا یہ خطاب ماہرین فن سے ہے۔ "کام کاتب کا" آواز لگانے والوں سے
نہیں۔ اور یہ آواز لگانے والے بھی افسوس کہ تمھارے ہی پیدا کیے ہوئے ہیں۔

قفس سے حسرت تعمیر لے کے نکلے ہم	بڑا زمانہ اسی فکر میں گذارا تھا
مگر نگاہیں یہاں دیکھیں سب کی تہ آلود	دلوں کا کھوٹ جبینوں سے آشکارا تھا
زباں خموش نظر منفعل دل افسردہ	کہ ہم نشینوں کے پہلو میں سنگ خارا تھا
کمال سنگدلی سے بجھا دیا تم نے	دلوں میں عزم محبت کا جو شرارا تھا
ذرا سی دیر میں تم نے کیا چمن کو خراب	ہمارے شوق نے برسوں جسے سنوارا تھا
گواہ سب تھے انھیں کے رفیق روز جزا	ہمارا شاہد عادل سحر کا تارا تھا
دل غیور کی مجبوریاں معاذ اللہ!	نہ ہو سکے جو گوارا وہ سب گوارا تھا

یہ کس مجاہد الفت کا تم نے خون کیا
گناہگار تھا واصف مگر تمھارا تھا

مشورہ ص ۱۰۵

فاضل مصنف نے مشورہ دیا ہے کہ میم کا الف کے ساتھ جوڑ ایسا لگاؤ جیسا ممنون
میں لگتا ہے۔ یعنی ما کے بجائے مما۔ ٹائپ کے حق میں تو یہ مشورہ ٹھیک ہے۔ لیکن ہاتھ سے

لکھنے والوں کے لئے اس مشورہ پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ جو خوبصورتی، آسانی، اختصار، طرزِ متعارف میں ہے وہ اس جدید مشورہ میں نہیں ہے۔ رہا تشابہ تو وہ بہت سی جگہ ہو سکتا ہے۔ اگر پڑھنے والا سیاق و سباق سے اور لفظ کے معنی سے واقف نہ ہو۔ یاد رہے کہ میم الف اور سے الف کا جوڑ بالکل یکساں ہے یعنی ب کے شوشے کی طرح نوک اس میں نہیں ہوتی۔ نیچے شوشہ ہے تو ہاں ہے۔ شوشہ نہیں ہے تو ماں ہے۔ اسی طرح ، میں اور ہیں، دونوں میں ابتدائی شوشہ نکیلا نہیں ہے۔ نیچے کے نکتہ سے امتیاز ہوگا۔

اساتذۂ فن تو بلا ضرورت سین کی کشش کو بھی معیوب قرار دیتے ہیں۔ اور محض کشش بلا حرف کو تو بہت ناپسند کرتے ہیں۔ لفظ قطعہ کو کشش سے لکھنا غیر مستحسن ہے اور لفظ تنسوی میں واؤ سے پہلے کشش آ ہی نہیں سکتی کشش کے ساتھ واو اور قاف کے جوڑ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس قسم کی فروگذاشتیں اور غلطیاں آجکل عام ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ صحیح تربیت یافتہ خوشنویس نہیں رہے۔ کتابت میں الفاظ کے مابین فاصلوں کو مناسب حد تک ملحوظ رکھتے ہوئے عبارت کو کھپانے کی واقفیت ہی مفقود ہو چکی ہے۔

اب دیکھیے کتاب "اردو املا" کے صفحہ ۵۰۳ پر پہلا پیرا (سے ہے) پر ختم ہوتا ہے۔ اگر لفظ مسئلہ کی غیر ضروری کشش نہ ہوتی اور ڈیش و کوما اور دیگر فاصلوں کے تناسب کا لحاظ رکھا جاتا تو (سے ہے) لکھ کر بھی کچھ جگہ خالی رہتی۔ چھوٹے چھوٹے لفظوں کے لئے پوری سطر ضائع کر دینا عام عادت بن گئی ہے۔

اسی کتاب میں سے اور چند مثالیں دیکھیے اور آپ خود غور فرمائیے کہ مندرجۂ ذیل الفاظ کی گنجائش کیا سطر ما قبل میں نہیں تھی؟ ص۱۵ ڈالا ہے۔ ص۲۶ ہیں۔ ص۳۰ ہے۔ ص۴۱ ہی نہیں۔ ص۴۸ ہیں۔ ص۵۱ چاہیئے۔ ص۹۰ جائے۔ ص۱۰۶ وغیرہ۔ ص۱۰۷ گی۔ ص۱۰۸ گا۔ ص۱۸۵ ہے۔ ص۳۲۳ جائے گا۔ ص۳۳۱ نہیں۔ ص۳۳۸ کے ساتھ۔ ص۳۷۹ بات ہے۔ محض ورق گردانی سے ہی سیکڑوں مثالیں ملیں گی۔ غیر ضروری کششوں پر خاص طور سے غور کیا جائے۔ بعض جگہ تو ستم ہی ڈھایا ہے۔ صرف گا، گی، ہے، ہیں، نہیں کے لئے پوری سطر کو ضائع کیا گیا ہے۔ بہت سی جگہ ایک سطر بلا وجہ اور بلا ضرورت خالی چھوڑی گئی ہے۔

زیر زبر اور نقطے لگانے میں آجکل کے ناتربیت یافتہ کاتب (اور ان کی اکثریت

ہی نا تربیت یافتہ ہے) بے انتہا تکلیف دہ اور پریشان کن بے احتیاطی کرتے ہیں۔ حرف کے اوپر کا زبر سطر بالا کے حرف کا زیر معلوم ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ قلم کی کتابت اور ٹائپ میں بہت فرق ہے۔ یہاں کمپوزینگ کی فنی کی کوئی دشواری نہیں ہے۔ صفحہ ۵۰۰ سطر ۱۷ میں پانچ لفظوں میں (ر) کا جوڑ ایک ہی قسم کا لگایا ہے جو غلط ہے۔

تضاد ص ۱۶۴ و ۵۰۲

فاضل مصنف نے ص ۱۶۴ پر عنوان "س۔ ص۔ ض" کے تحت لکھا تھا کہ جب دو س یا ش ایک ساتھ آئیں یا ایک دو حرف کے فصل سے آئیں تب کشش دار سین یا شین لکھنا مناسب ہوگا۔ جیسے کشش، کشمکش، کشمش۔ الخ۔ یہ دو کششوں کا اجتماع اور شین میم کا جوڑ ماہرین فن کے لئے دعوت نظارہ ہے۔

ص ۵۰۲ پر لکھتے ہیں کہ قطعہ، منسوخ، منافع، مقطع، خط جیسے لفظوں میں اس زائد کشش کا داخلہ ممنوع ہونا چاہیے۔

ص ۵۰۳ پر سہوا "اہم۔ ہمت" میں ہائے ہوز کا جو شوشہ بنایا گیا ہے یہ ہائے ہوز کی شکل نہیں ہے۔ پہلے واضح کر چکا ہوں کہ ۃ کی گھنڈی میں اور ب وغیرہ کے شوشہ میں فرق ہے۔

کاتب صاحب سے درگذر کا طالب ہوتے ہوئے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے فن میں مداخلت بلا وجہ نہیں کر رہا ہوں۔ کچھ تھوڑی سی واقفیت احقر کو بھی فن خطاطی سے ہے۔ احقر کے سلسلۂ اساتذہ میں دو مقتدر ہستیاں سراج الدین نام کی ہیں۔ شاعری کی ٹوں ٹاں میں تو بلاواسطہ نواب سراج الدین احمد خاں سائل سے اور خوش نویسی کی ابجد میں اعلیٰ حضرت ظل سبحانی سراج الدین ظفر بہادر شاہ سے بالواسطہ شرف تلمذ حاصل ہے۔ میں نے الف بے تے کی مشق کی استاد عبد الغنی سے اور وہ شاگرد تھے اپنے والد منشی ممتاز علی کے اور وہ شاگرد تھے بہادر شاہ ظفر کے۔

نسبت ہے بہت بڑی مگر خود کیا ہے   بدنام کنندۂ نکو نامے چند

غور فرمائیے! یہ فن شریف تخت شاہی سے پٹڑیوں پر جا پہنچا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

چینوٹی ص ۵۲۳

فاضل مصنف نے مولوی عبدالحق کی کتاب قواعد اردو کا اقتباس دیا ہے:-

بعض الفاظ میں ی بھی اپنے پہلے کے ساتھ اس طرح مل کر پڑھی

جاتی ہے کہ وہ دونوں ایک آواز معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے کیا، کیاری پیارا، دصیان، چیونٹی، اگیارہ ـــ اس کا نام ہم نے یائے معدولہ رکھا ہے۔

غرض ہے کہ لفظ چیونٹی کے تلفظ میں علاقائی اختلاف ہے۔ اہل دہلی کے تلفظ میں واضح طور پر یائے معروف اور واو موقوف ہے۔ یوپی میں ج مکسور ہی رہ جاتی ہے اور یا پر چڑھ جاتی ہے۔ اور بعض مرتبہ مضموم ہو جاتی ہے۔ اب رہی کتابت میں نون غنہ کے مقام کی تعیین۔ یہی کام بہت مشکل ہے۔ آصفیہ میں نون غنہ کو واو اور ٹے کے بیچ میں لکھا گیا ہے۔ لیکن میں (ی) اور واو کے بیچ میں جگہ دیتا ہوں۔ کیوں؟ میری دلیل یہ ہے کہ اسی لفظ کا دوسرا تلفظ بھی ہے اور دہلی میں عام ہے چیمٹی اور چمٹا۔ ممکن ہے دوسرے مقامات میں بھی کہیں ہو۔ اور اسی تلفظ سے لفظ چمٹا بمعنی آتش گیر معرض وجود میں آیا ہے۔ چیونٹے کے جبڑے اور آتش گیر دونوں میں مشابہت ظاہر ہے۔ دہلی میں آتش گیر کو دست پناہ کہتے ہیں اور سادھوؤں کا چمٹا کہلاتا ہے۔

نون غنہ اور واو مخلوط ہو کر میم بن گیا۔ اور واو تنہا میم کا مخرج اختیار نہیں کرسکتا جب تک ری، کے کھنچاؤ کے ساتھ نون غنہ شامل ہو کر نہ آئے اور بغیر نون غنہ کے واو کا تلفظ ہو گیا تو بعد میں نون غنہ کی آواز پیدا نہیں ہوسکتی اور بالفرض ہو بھی جائے تو واو کو مبدل بہ میم کرنے کا عمل نہیں ہو سکتا۔ تو جبکہ نون غنہ کی آواز واو سے پہلے ضروری ہے تو کتابت میں بھی اس کا مقام متعین ہے۔

علاقائی اختلاف لہجہ کی مثال میں ایک اور لفظ پیش کرتا ہوں۔ لفظ ڈیوڑھی کو دہلی والے بکسر اول و یائے مجہول ساکن، واو ملفوظ موقوف (بروزن پینگی) بولتے ہیں۔ لیکن یوپی میں اس کا تلفظ بھی چیونٹی کی طرح ہے۔ یعنی ڈال مکسور واو سے ملتی ہوئی مائل بضمہ ہوتی ہے۔

اس کا ماخذ لفظ ڈیوڑھ (بروزن زیور) ہے جس کے معنی تسلسل کے ہیں۔ اور اسی معنی میں دہلی میں بولا بھی جاتا ہے۔ ڈیوڑھی میں آمد و رفت کا تسلسل ہوتا ہے۔ وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔

یائے معدولہ ص۵۲۷

لکھتے ہیں :۔ واؤ معدولہ کی طرح تین حرف اور ہیں جو نصف سے کچھ کم تلفظ میں آتے ہیں۔ بلکہ صحیح معنی میں ان کی آواز حرف ماقبل کی آواز میں مخلوط ہو جاتی ہے۔ یہ حرف ہیں ، ہ ، ء ، ی۔ جیسے پیار ، پہیا ، گمئی۔ عروض میں پیار کو تین حرفی لفظ مانا جائیگا بروزن پار۔ اس سے آواز کے مخلوط ہونے کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے اس ی کو یائے معدولہ لکھا ہے اور یہ مناسب نام ہے۔ اسی قیاس پر ہمزہ معدولہ اور ہائے معدولہ کہا جائیگا۔ اسی طرح حروف معدولہ چار ہوئے۔ و ، ہ ، ء ، ی۔

ہاں اس ی اور ہمزہ کو یائے مخلوط اور ہمزۂ مخلوط بھی کہا جا سکتا ہے۔ مگر ان کے ساتھ کے ایک اور حرف ہ کو ہائے مخلوط نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ہائے مخلوط کی اصطلاح ابتک دو چشمی (ھ) کے لئے استعمال ہوتی رہی ہے۔ اس لئے ان سب حرفوں کو معدولہ کہا گیا ہے۔ امثلہ :۔

واؤ معدولہ :۔ خود ، خواہش ، خوراک ، خوردن ۔ خواب ، خوار ، خواہش ، خواستگار۔ ہوائے ، جوائنٹ ، کوالی فائڈ۔

ہائے معدولہ :۔ پہیا ، کہیو ، رہیو ، چہیا۔

ہمزہ معدولہ :۔ چمئی ، گمئی ، ارئی ، ترئی

یائے معدولہ :۔ پیاسا ، کیا ، کیاری ، نیولا ، نیورانا ، کیوڑا ، جیوڑا۔

عرض ہے کہ سابقہ اوراق میں بھی اظہار خیال کیا جا چکا ہے کہ جس واؤ کو معدولہ کہہ کر معطل کر دیا گیا ہے اس کی کارفرمائی اب بھی موجود ہے۔ فاضل مصنف نے بھی ص۵۳۲ پر لفظ ہوائے کے ضمن میں ایسا ہی لکھا ہے۔ اور جن کو یائے معدولہ ، ہمزۂ معدولہ اور ہائے معدولہ کہا گیا ہے وہ بھی غیر ملفوظ نہیں ہیں۔ لہٰذا چاروں حرفوں کو معدولہ کے بجائے مخلوطہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ دیکھیے :۔

ہائے معدولہ :۔ مندرجۂ بالا مثالوں میں ہ ، ی کے ساتھ مخلوط ہے (چہیا املا

غلط ہے چوہیا صحیح)

ہمزۂ معدولہ کی مثالوں میں ہمزہ ی کے ساتھ مخلوط ہے۔ یہاں ہمزہ فتحۂ ماقبل یائے معروف کی نشانی کا فائدہ بھی دے رہا ہے۔ اور کہیں یہ نشاندہی کرتا ہے۔ الفِ حذف شدہ کی، جیسے ڈنگا سے ڈنگئی اور چپا سے چپئی۔

یائے معدولہ کی مثالوں میں سے دو لفظوں (پیاسا اور کیا) میں یائے مخلوط ہے اور باقی مثالوں میں یائے ملفوظہ ہے۔

دوبارہ پھر عرض کرتا ہوں کہ ہر جگہ املا کو تلفظ کے مطابق نہیں کیا جاسکتا۔ عام طور پر روانی میں لفظ کی ہیئت بگڑ جاتی ہے۔ مثلاً مجھے کو مجھے، تجھے کو تجھے، پھر کیا ہوا کو پھ کیا ہوا بول جاتے ہیں۔ باغ کی سیر کر یاؤ، کھانا کھایاؤ، بھوک لگ یائی وغیرہ عام لہجہ ہے مگر املا ایسا نہیں ہوگا۔ لفظ غرض کو غرز ہی بولا جاتا ہے۔ اور اس دھرتی پر غرض کو گرج بولنے والے بھی موجود ہیں۔ مجتہدینِ املا اس کا کیا املا تجویز کریں گے؟

اور بعضوں کی زبان موٹی ہوتی ہے یا تیز بولنے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ تو روانیٔ کلام میں آدھے آدھے لفظ کھا جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ اصول بنا لینا کہ املا کو تلفظ کے مطابق کیا جائے ممکن نہیں اور غلط بھی ہے۔ اصول یہ ہونا چاہیے کہ لغات کا املا وہ اختیار کرو جو اصل اور ماخذ سے قریب تر ہو تاکہ لغت کا ماخذ و مادہ نسیاً منسیاً نہ ہو جائے اور حتی الامکان لکھنے کے مطابق تلفظ کرنے کی کوشش کرو۔ مثلاً فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ لفظ منجھ کی ہائے مخلوط کثرتِ استعمال سے ساقط ہو گئی ہے۔ لہٰذا اس کا املا منجدھار ماننا چاہیے۔ میں عرض کروں گا کہ املا اصل کے مطابق ہونا چاہیے۔ خواہ روانیٔ کلام میں تلفظ کچھ بھی ہو۔ منجھدھار لکھنا چاہیے اور اسی طرح بولنے میں بھی صحیح تلفظ کرنا چاہیے۔ اسی طرح لفظ بندھی میں بھی دال کے ساتھ ہائے مخلوط کا تلفظ ہونا چاہیے۔ لفظ ہے ہی کو فاضل مصنف نے ہیئ لکھا ہے، سراسر غلط۔ لہجہ میں کچھ بھی ہو لیکن املا میں پورا ہے ہی لکھا جائیگا۔ (دیکھو صـ ۳۵۳) شاید لفظ بھئی پر قیاس کیا ہو۔ اُس پر قیاس کرنا غلط ہے کیونکہ وہ تکیہ کلام کے طور پر بولا جاتا ہے۔ جیسے، اے بھئی ابا! اے بھئی ماموں! اے بھئی بھائی! یعنی بھائی سے الگ اک مستقل لفظ بن گیا ہے۔ اور دیکھیے۔ ہم اپنی گفتگو میں عام طور پر اس طرح بولتے ہیں۔ بھوک لگ یائی، بازار ہو یاؤ، سیر کر یائے،

سبق پڑھ یاؤ، کھانا کھایاؤ۔ یہ بالکل قدرتی اور لابری لہجہ ہے اور فصیح ہے۔ لیکن اس طرح لکھا نہیں جاتا۔ املا اصل کے مطابق لگ آئی، ہو آؤ وغیرہ ہے۔ اس تلفظ میں آنا اور اس کے ہمزہ کو "ی" سے بدلا گیا ہے۔ واضح ہو کہ آنا میں حرف اول ہمزہ ہے۔ اور حرف دوم الف ساکن۔ اگر یہ تبادلہ نہ ہو تو روانیٔ کلام میں ہمزہ غائب ہو جاتا ہے۔ پھر یا تو لفظ مہمل ہو جاتا ہے یا دوسرا فعل بن جاتا ہے یا اجتماع ساکنین ہو جاتا ہے۔ جیسے لگائی، ہواؤ، کرائے، پڑھاؤ، کھاؤ۔ اب فرمایئے۔ املا تلفظ کے مطابق ہونا چاہیے یا نہیں؟ اور یہ تلفظ صرف اردو سے مخصوص نہیں۔ فارسی میں بھی اس کی مثال موجود ہے۔ جیسے آ سے بیا، میا ۔ اور آر سے بیار، میار۔ افگن سے بیفگن، میفگن وغیرہ۔ ہم آپ سے یہ نہیں کہتے کہ لفظ مسالا، اور نہودی کو اصل کے مطابق لکھو اور اصل کے مطابق بولو۔ وہ اور بات ہے۔

مندرجۂ ذیل الفاظ میں علاقائی لہجے کا اختلاف ہے۔ کیاری، دہلی کے لہجے میں بروزن پٹاری ہے۔ نیولا اور کیوڑا بروزن کیکڑا۔ اور تیورانا بھی انھیں کے مطابق غالبؔ کہتے ہیں :۔

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں

جیوڑا، بکسر اول ویائے معروف ساکن واؤ موقوف، بروزن ٹھیکرا۔ جو ہیا میں واؤ ضرور لکھا جائیگا۔

سرہانا ص ۶۲۸

لکھتے ہیں :۔ میرؔ کا ایک شعر ہے ؎

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

کلیات میر مرتبۂ آسی میں سرھانے بجائے دو چشمی لکھا ہے۔ اگر سرہانے لکھا جائے تو مصرع بحر سے خارج ہو جائے گا۔

فاضل مصنف کا مطلب یہ ہے کہ سرھانے کو سرہانے لکھنے سے ہی مصرع بحر سے خارج ہو جائیگا۔ حالانکہ وزن شعر کا تعلق پڑھنے سے ہے۔ جن کو شعر پڑھنا نہیں آتا وہ کبھی کسی شعر کو صحیح وزن کے مطابق پڑھ ہی نہیں سکتے۔ شعر پڑھنے کا ذوق ہر ایک کو نہیں ہوتا۔ اور بچوں کو تو جب تک خوب مشق نہ کرائی جائے۔ صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ اتفاق سے آج

کی ڈاک میں ایک رسالہ ماہنامہ موصول ہوا۔ اس میں ایک مشہور اور پرانے ادیب و صحافی کا مقالہ ہے۔ انھوں نے مقالے کے آخر میں ایک مشہور مصرع کو اس طرح لکھا ہے۔ خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ جن کو شعر کا ذوق نہیں ہوتا وہ صحیح وزن کے ساتھ نہ پڑھ سکتے ہیں نہ صحیح یاد رکھتے ہیں۔

اردو میں ایک لفظ ہے "ہاں" اسم ظرف ہے۔ یہاں، وہاں، کہاں، جہاں، سرہانا، سمدھیانا۔ اسی سے مرکب ہو کر بنے ہیں۔ یوپی میں پائنتی ہانا بھی بولا جاتا ہے۔ اصل میں ہائے مخلوط نہیں ہے۔ کثرت استعمال سے سرھانا میں تلفظاً مخلوط ہو گئی۔ لیکن املا میں دو چشمی لکھنے کی ضرورت نہیں املا میں اصل کو قائم رہنا چاہیے۔ بولنے میں پڑھنے میں اختیار ہے جس طرح چاہو بولو اور پڑھو محض لکھنے سے شعر کا وزن نہیں بگڑتا۔ یوں تو دوسرا مصرع بھی بحر سے خارج ہے۔ اس کو یوں لکھنا چاہیے تھا:—

ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

یوپی میں محاورہ بولا جاتا ہے مثلاً وہ کل میرے یہاں آئے۔ میں بھی ان کے وہاں جاؤں گا۔ اہل دہلی اس میں یہاں وہاں نہیں بولتے۔ دونوں جملوں میں صرف ہاں بولتے ہیں۔ اس طرح:— وہ کل میرے ہاں آئے۔ میں بھی ان کے ہاں جاؤں گا۔ دہلی میں پائنتی ہانا کے بجائے صرف پائنتی کہا جاتا ہے۔

اعراب بالحروف ص۶۳۳

لکھتے ہیں:— اعراب بالحروف کے طور پر جو واؤ پہلے لکھا جاتا تھا اور جو صرف پیش کی نشاندہی کرتا تھا اور مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ حرف ماقبل کو پیش ہی کے ساتھ پڑھا جائے اُس واؤ کو اب حذف کر دیا جائے گا۔ اور اُس کی جگہ ضرورت کے مطابق پیش لگایا جائیگا۔ یہ واؤ جس کو حذف کیا جائیگا اصلاً لفظ کا جزو کبھی نہیں تھا۔ شروع میں محض بربنائے احتیاط اور بعد کو بربنائے روش اِس کو لکھا جانے لگا۔ یہی مقصد اب پیش سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جیسے دکان، پہونچنا، ادس، ادن، ادھر، مونہ وغیرہ کسی میں واؤ نہیں لکھا جائیگا۔ پیش اور زیر پابندی کے ساتھ لگایا جائیگا۔

فاضل مصنف کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اوس اور اودھر میں جو واؤ لکھا جاتا تھا۔ وہ اصل کے لحاظ سے لفظ کا جزو نہیں تھا۔ یاد رہنا چاہیے کہ انگریزی فارسی اور سنسکرت تینوں زبانیں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں اور تینوں میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ دیکھو۔ فادر، پدر، باپو ــ مدر، مادر، ماترــ برادر، برادر، بیرــ شادر، شار، پچھاورــ تھری، سہ، تری ــ فائیو، پنج، پانچ ــ سکس، شش، چھ ــ سیون، ہفت، سات ــ ایٹ، ہشت، آٹھ ــ وغیرہ۔ دہلی کے آس پاس کے دیہات میں یہاں وہاں کہاں کے معنی میں انگھے او نگھے کنگھے بولا جاتا ہے۔ یہ این گاہ، آں گاہ، کدام گاہ کا تبدیل شدہ تلفظ ہے۔ چولھے کے اندر کا حصّہ جہاں لکڑیاں رکھ کر جلائی جاتی ہیں اُس کو گھئی کہتے ہیں۔ یہ بھی گاہ سے تبدیل ہوا ہے۔ اور خود لفظ جگہ بھی جائے گاہ تھا۔ روٹیوں کی گڈی کو تھئی کہتے ہیں۔ یہ تہ کا تبدیل شدہ ہے۔

یہ اور اسی قسم کے بہت سے الفاظ جو دیہات کے جاٹوں اور گوجروں میں پائے جاتے ہیں کیا یہ ایران سے میل جول کا نتیجہ ہیں ؟ ایران سے میل جول محض سیاسی طور پر کچھ عہد مغلیہ میں رہا اور سیاسی حلقوں تک محدود تھا۔ دیہات کی اس ان پڑھ مخلوق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بات یہ ہے کہ ہزاروں برس پہلے جب یہ لوگ یہاں آئے تھے اُس وقت کی کچھ نشانیاں اب تک باقی چلی آ رہی ہیں۔ آب و ہوا کے اثر سے بعض میں معمولی تبدیلی ہوئی اور بعض میں ایسی تبدیلی ہوئی کہ اصل کا کھوج نہیں ملتا۔

اب راقم کی قیاس آرائی سُنیے :۔ اوس مخفف ہے اوست کا، پھر س ہ کا تبادلہ ہو کر وہ بنا۔ اِس مخفف ہے ایں ست کا، پھر س ہ کا تبادلہ ہو کر یہ بنا۔ کِس مخفف ہے کیست کا، کِس اور کہ ایک ہی ہے۔ اون اور اُنھوں مخفف ہے آناں یا آنہا کا۔ اِن اور اِنھوں مخفف ہے ایناں یا اینہا کا۔

گاہ اور دھر دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ شہروں میں اون گہ کے بجائے اودھر اور ایں گہ کے بجائے ایدھر، کی گہ یا کجا کے بجائے کیدھر بولنے لگے۔

لہٰذا راقم کے خیال میں ــ اوس، ایس، اودھر، ایدھر، اون، این، کیدھر، جیدھر، اونیس، اونتیس، اونتالیس وغیرہ، اونچا، نیچا، موکھ، مینہ، پہونچنا، اوگنا، اوبلنا، اوبھرنا، اوٹھنا وغیرہ سب میں واو اور یا جزو لفظ ہے۔ البتہ دکان میں واؤ

بالکل زائد اور فضول ہے۔

جب تلفظ میں اختصار ہوا تو یہ دونوں حرف اعراب بالحروف اور اصل کی یادگار کے طور پر کتابت میں باقی رہے۔ پھر جب اصل کو فراموش کر دیا گیا اور صرف امتیاز ہی مقصد رہا تو یؔ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی صرف واؤ باقی رہ گیا۔

عہد انگلشیہ میں پہلے کلکتہ دارالحکومت تھا۔ وہاں اُردو کی سرپرستی کی گئی۔ ۱۹۱۱ء میں دہلی کو دارالحکومت بنایا گیا۔ لیکن محکمۂ تعلیم دہلی اور پنجاب کا ایک ہی تھا اُردو کی خدمت کا مرکز لاہور رہا۔ اُردو کے ادیب و شاعر وہاں جمع ہوئے۔ نصاب کی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اہل پنجاب نے اردو ادب کی بڑی دلچسپی اور خلوص سے خدمت کی۔ مگر چونکہ یہ خود اہل زبان نہیں تھے بہت سی منطقیانہ تبدیلیاں کرنی شروع کر دیں۔ اگرچہ دہلی کے اہلِ کمال بھی وہاں کی ٹیکسٹ بُک کمیٹی میں پہنچ چکے تھے۔ مثلاً محمد مرزا بیدل، محمد حسین آزاد وغیرہ مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ اور محمد حسین آزاد تو اہل پنجاب کو صحیح و فصیح اور ٹکسالی اردو سکھانے کے بجائے خود وہاں کی زبان سیکھ آئے۔ مثلاً مقدمہ دیوانِ ذوق ص۳ سط۱۶ میں ہے۔ استاد نے ہنس دیا ص۱۵ سط۹ میں ہے۔ میر نجات کی گل کشتی ہم نے دیکھی ہوئی تھی۔ ص۵ سط۱۶۔ میر صاحب کو ان کے معاملے پر درد آیا ص۲۲ سط۱۔ ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اعراب بالحروف سے عملی طور پر انکار وہیں سے شروع ہوا۔ اور چونکہ تمام پنجاب، دہلی اور راجپوتانہ میں وہیں کا مرتب کیا ہوا کورس چل پڑا بلکہ انجمن حمایت الاسلام کا مرتب کردہ کورس تمام ہندوستان کے مسلمان بچوں میں رائج ہوا، نتیجہ یہ کہ وہاں کی عمل میں لائی ہوئی تبدیلیاں (خاصکر املائیں) بروئے کار آہی گئیں۔

یہ محض ایک منطقی اپج تھی کہ جس حرف کا تلفظ نہ ہوتا ہو اسکو کتابت میں بھی نہیں رہنا چاہیے۔ آسکول، اسٹیشن میں سین متحرک ہوجائے تو کوئی پروا نہیں مگر الف چونکہ انگریزی میں نہیں ہے اس لئے نہیں بڑھایا۔ سستانا کو فرض کیا گیا کہ سُست سے بنا ہے لہذا بضم ہونا چاہیے۔ یہ خصوصیت تو بھیڑ میں پائی جاتی ہے کہ جس طرف ایک چلتی ہے سب اُسی طرف چل پڑتی ہیں لہٰذا محاورے میں ترمیم کر دی۔ بھیڑ چال کر دیا۔ وغیرہ۔ اور غضب تو یہ ہے کہ بعض ناواقف اہلِ زبان ان اکتسابی ادیبوں کے بہکائے میں آجاتے

ہیں۔ ایک دلی والے سے میں نے سُنا" آجکل ان کی طوطی خوب بول رہی ہے" میں نے ٹوکا تو کہنے لگا فلاں بابو جی جو ہمارے پڑوس میں رہتے ہیں وہ کہتے ہیں طوطی تو طوطے کی مادہ ہے اس لئے مؤنث ہے۔ میں نے اس کو سمجھایا کہ یہ دوسرا پرندہ ہے اور دہلی کی زبان میں مذکر ہے ـــــ دیکھو استاد ذوق کہتے ہیں ـ

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا

آج تجدد میں انتہا پسندی کے باوجود اعراب بالحروف کی اہمیت کا احساس دل کی گہرائیوں میں موجود ہے جس کا اعتراف اس اقتباس میں ہے جو فاضل مصنف نے اردو املا کے صفحہ ۴۳ پر دیا ہے :ـــ

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے لکھا ہے :ـــ

سید انشا نے "اوس" پر اعتراض کیا ہے۔۔۔۔۔ لیکن اس لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِس اور اُس دو لفظ ایک دوسرے کے متقابل تھے۔ وہ دونوں گونگے ہو گئے۔ اکثر اوقات یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ کسی عبارت کو پڑھنے میں جب تک اس کا پہلے سے مطالعہ نہ کر لیا جائے پڑھنے والا ٹھوکریں کھاتا ہے اور سننے والے کو اُلجھن ہونے لگتی ہے۔ سب سے بہتر ہوگا کہ اُس کو ہمیشہ پیش کے ساتھ اور اِس کو ہمیشہ زیر کے ساتھ لکھیے۔ پرانے زمانے میں جن لوگوں نے واؤ سے کام لیا چنداں بیجا نہ تھا۔ انھوں نے اوس پورا لکھا اور کاتب کی محنت بچانے کو اِس کو بغیر اظہار حرکت لکھا۔

(اردوئے معلّٰی، اردوئے قدیم نمبر حاشیہ صفحہ ۷۹)

اور خاص کر جملہ شرطیہ میں لفظ اُس، اُن جزائیہ کو جب بالکسر پڑھ دیا جاتا ہے تو بڑی وحشت ہوتی ہے۔ اور از روئے گرامر اُس اور اُن جزائیہ مضموم ہی ہوتا ہے جیسے جس کتاب کا تم نے ذکر کیا ہے اس کو میں نے پڑھا ہے۔ جس نے کوشش کی اس نے پایا۔ جو سچ بولتے ہیں اُن کو کوئی خوف نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں لفظ اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لفظ مثلاً اُدھر، دھر، اِدھر، اُن اِن وغیرہ بالکل گونگے ہو گئے۔ اور ہمیشہ کے لئے دردِ سر بن گئے۔ اور

لکھنے پڑھنے والوں کو بہت زیادہ زحمت میں ڈال دیا گیا۔ پہلے صرف ایک میں واؤ لکھا جاتا تھا۔ اب زیر زبر پیش لکھنا ضروری ہوا۔ واؤ اک حرف اور جزو لفظ ہونے کی وجہ سے ضرور قلم سے نکلتا تھا۔ لیکن اعراب لکھنے کی پابندی دنیا میں کسی قوم کسی ملک اور کسی زبان میں نہیں ہوئی نہ ہو سکتی ہے۔ غالباً دنیا میں سب سے پہلے قرآن مجید میں لغرض حفاظت اعراب لگائے گئے۔ وہ بھی عہد بنی امیہ میں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور خلفائے راشدین کے عہد میں نہیں تھے۔ اور آج بھی یہ خصوصیت صرف قرآن مجید کی ہے۔ اور یہ بات بھی تحقیق طلب ہے کہ زیر زبر پیش جزم وغیرہ یہ زمانہ وحی میں موجود تھے یا بعد میں ایجاد ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین مقدسہ میں تو نقطے اور اعراب کچھ بھی نہیں ہے۔

عام تحریروں میں کوئی اعراب لگانے کا عادی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس پابندی سے قدرتی طور پر دل گھبراتا ہے۔ اور اسی وجہ سے دوسری زبانوں میں بھی اعراب بالحروف کا رواج ہوا۔ انگریزی میں بھی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی اور زبر پیش عربی فارسی میں بھی اور سب سے زیادہ ہندی میں اعراب بالحروف کا رواج موجود ہے۔

دیکھیے قلبی تاثر کے باوجود ڈاکٹر صاحب جرأت کے ساتھ یہ نہ کہہ سکے کہ حذفِ واؤ سے بہت نقصان ہوا۔ اب اس واؤ کو واپس لانا چاہیے۔ املا میں انقلاب لانے کی کتنی شاندار مہم چلائی گئی۔ اور سیکڑوں الفاظ کی مانوس و متعارف اور خوبصورت ہیئت کو بلا ضرورت مسخ کرنے کے لئے خوب خوب شجاعت کے جوہر دکھائے گئے مگر یہاں ضرورت کا احساس ہوتے ہوئے بھی تجدد پسندانہ ذہنیت کے آگے سپر ڈالنی پڑی۔

کہ یہ وغیرہ ص ۱۴۱

لکھتے ہیں: — آخر لفظ میں واقع ہائے ملفوظ متصل کے نیچے شوشہ لگانے کا رواج بھی گو یا نہیں تھا۔ جب کہ ہائے مختفی و ملفوظ میں وجہ امتیاز یہ شوشہ ہی ہوتا ہے۔ اب ایسی ہرہ کے نیچے لازماً شوشہ لگایا جائیگا جیسے یہ، بہ، نہ، مہ، کہ وغیرہ

اوہ! لکھنے سے پہلے کئی دن تک لائبریروں کی پیر دوڑی کرنی پڑے گی۔ اس امر کی تحقیق کرنے کے لئے کہ خط میں جو لفظ لکھنا ہے یا لکھدیا ہے آیا اس میں ہائے ملفوظ ہے

یا ہائے مختفی ؟ حالیہ، مسلّمہ، مطبوعہ، غنہ، نقطہ، شوشہ، یہ، بہ، قصہ، خطہ، وغیرہ
میں کونسی ہ ہے۔ لکھتے وقت فوری طور پر تو سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ایک خط کسی دوست
کو کیا معلوم کتنے دن میں لکھا جا سکے گا۔ ہم تو خیر مر پٹ کے کر بھی لیں گے لیکن عام
لوگ جن کو ڈکشنری دیکھنی بھی نہیں آتی وہ کیا کریں گے ؟

ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر کسی نے خطہ، قصہ، وجہ اور " نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را"
بغیر شوشے کے لکھدیئے تو کیا اُن کا پڑھنا ممکن نہیں ہے ؟ مصرع میں کہ کو بالضم اور مہ
کو بالفتح بھی پڑھا جا سکتا ہے تو سیدھی سی بات کیوں نہ کہدی جائے کہ آئندہ سے اردو
کی تمام کتابیں قرآن مجید کی طرح پورے اور مکمل اعراب کے ساتھ شائع کی جائیں۔
اور کوئی خط و کتابت بھی بغیر اعراب کے نہ کرے۔

تحریفِ ہائے مختفی ص ۶۴۲

لکھتے ہیں : ۔جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی ہوتی ہے۔ جیسے کعبہ، خانہ
پردہ وغیرہ ۔ تو محرف ہونے کی صورت میں ہائے مختفی سے پہلے والا حرف
جو اصلاً مفتوح ہوتا ہے، مکسور ہوجایا کرتا ہے۔ اور اس لئے کتابت
میں وہ ہائے مختفی یائے مجہول سے بدل جاتی ہے ......
...... اب ایسے سارے مقامات پر محرف صورت میں ہائے مختفی کی
جگہ یائے مجہول لکھی جائے گی اور اس کو لازم سمجھا جائیگا۔ اور اس
میں کسی طرح کے استثنا کو دخل نہیں دیا جائیگا۔

ٹھیک ہے۔ اب تو یہی رواج ہے۔ لیکن یہ بات بھی اب تک یاد ہے کہ راقم الحروف
کو جب والد ماجد نے قاعدہ پڑھایا تھا تو ہجے یوں کرائے تھے۔ کاف عین زبر کع، ب زیر
بہ، م یے نون غنہ زیر میں۔ کعبہ میں۔ وہ باتیں اب بہت پرانی ہوگئیں۔ رہا استثنا، تو
اس سے مفر نہیں۔ آپکے بنائے ہوئے قوانین کی ہر ایک دفعہ میں استثنا موجود ہیں۔ اور
چند مثالیں۔ اسلحہ، ریختہ، ہمشیرہ، دوشیزہ، آمادہ، آشفتہ، وابستہ، برجستہ، بہہ
دل گرفتہ، ناکارہ، روزمرہ، ناخواندہ، شیفتہ، شکستہ، خستہ، مطبوعہ، خالہ وغیرہ۔

مانتے جانتے ص ۶۴۵

قدیم مخطوطات کے رسم الخط وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مصنف لکھتے

ہیں۔ یہ تو ایک مخطوطے کا حال تھا۔ اب ایک مطبوعہ کتاب کو دیکھیے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے عودِ ہندی کی پہلی اشاعت (مطبوعہ مطبع مجتبائی میرٹھ) کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے :۔

"کاتب اس نسخہ کا غلط نویس اور بدا ملا ہی نہیں رسم خط بھی نہیں جانتا اور غلطیوں سے قطع نظر لفظوں کو بُری طرح توڑتا ہے۔ مانتے جانتے، دینا، کو بے تکلف مان تے، جان تے، دے نا لکھ دیتا ہے اسی طرح تر ڈیڑھ کو ترسے سٹھ اور پھانسی کو پھان سی۔ ایک جگہ پڑھو! دیکھیگا" آیا تو اُسے لکھتا ہے پڑہ داد یجے گا۔ بعض جگہ تو عبارت کا پڑھنا دشوار ہو گیا ہے۔ (مقدمہ خطوط غالب صـ)

معلوم ہوا کہ الفاظ کے ٹکڑے کرنے کی مہم سو برس پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اُس کی تقلید اب کسی حد تک تو کی جا رہی ہے۔ ممکن ہے آئندہ نسلیں باقی ماندہ صورتوں کو بھی قبول کرلیں۔

مانتے جانتے کا مادہ مان، جان ہے۔ اسی پر صیغوں کی علامتیں لگتی ہیں۔ علامت مصدر (نا) علامتِ ماضی (الف) علامت مضارع (ے) علامت حال (تا ہے) علامت استقبال (گا) وغیرہ۔ گا کے بارے میں تو آپ کا یہ ناطق فیصلہ ہو چکا ہے کہ ملا کر ہرگز نہیں لکھا جائیگا۔ بلکہ اگر۔ گا، گی، گے، دوسری سطر میں تنہا جا پڑے تب بھی خوبصورت ہے۔ (دیکھیے صـ۱۰۷ سـ۹ اور صـ۵۵۸ سـ۹)

عودِ ہندی کے کاتب نے اگر دوسرے صیغوں کی علامتوں کو بھی الگ کر دیا تو گلہ شکوہ کیا ہے۔ اس نے ایک راہ عمل تیار کر دی ہے۔ آپ کو اختیار ہے تقلید کریں یا نہ کریں۔ ترے اور سٹھ بھی دو مستقل لفظ ہیں (تری اور ساٹھ) یہی آپ کا حکم ہے کہ دو لفظوں کو ملا کر نہ لکھو۔ بلکہ یہ تو دونوں اسم ہیں۔ آپ تو حروف جارہ وغیرہ کو ملا کر لکھنے سے منع کرتے ہیں جیسے بلکہ، جبکہ وغیرہ۔

سیر مرادف پیاز صـ۶۲

اقتباس میں سیر مرادفِ پیاز دیکھ کر شک پڑ گیا۔ اس کی تحقیق کرلی جائے۔ لفظ مرادف سے مصنف کی کیا مراد ہے۔ واللہ اعلم۔

کتاب کا سرسری مطالعہ کرنے میں جہاں کہیں اپنے خیالات کا اظہار ضروری سمجھا اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے تحریر کر دیا گیا ہے اور دورانِ تحریر کوشش یہ رہی ہے کہ ادب و احترام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ تاہم اگر کہیں کچھ جذباتیت آگئی ہو تو عفو و درگذر کا طالب ہوں۔

آپ نے کتاب میں بہت سے اصطلاحی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اور بعض تو غیر مانوس، نو ایجاد اور مشکل ہیں۔ مثلاً انفیانا وغیرہ۔ اور صراح وغیرہ سے مدد بے بغیر ان کے معانی کا سمجھنا بھی دشوار۔ اور میں نے اپنی تحریر میں شاید اور بھی زیادہ اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ مگر۔ بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر۔ دیکھیے! ہم دونوں نے مل کر ردو کو کس قدر بوجھل بنا دیا ہے۔

بہر حال امید ہے کہ ٹھنڈے دل سے میری گذارشوں پر غور کیا جائیگا۔ اصل مقصود آپکو دعوتِ تحقیق دینا ہے نہ کہ الزام دینا۔ اور لغزش و خطا سے پاک صرف ذات باری تعالیٰ ہے۔

واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین

حفیظ الرحمان واصف۔ ۲۵ جون ۱۹۷۶ء

دو رباعیاں

پنڈت آنند نرائن مُلّا

اک موت کا جشن بھی منا لیں تو چلیں | پھر پونچھ کے اشک مسکرا لیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگا کے مٹتی اردو! | ایک اُردو گیت اور گا لیں تو چلیں

یہ سانحہ اُنیس سو ستتر میں ہوا | ہندی کی چھری تھی اور اُردو کا گلا
اردو کے رفیقوں میں جو مقتول ہوئے | مُلّا نامی سُنا ہے شاعر بھی تھا

اخبار نئی دنیا ہفت روزہ مورخہ ۲۸ نومبر ۱۹۷۷ء

لفظ ہندی پر حاشیہ ہے "یا جنتا کی چھری کہیے"۔ چھری نہ ہندی کی ہے نہ جنتا کی ہماری اپنی ہی ہے۔ واصف۔

گھر ہی میں آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اردو کیسے لکھیں

زبان و قواعد، اردو املا کے مصنف کی ایک تیسری کتاب بڑے اعلیٰ پیمانے پر شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے "اردو کیسے لکھیں" یہ مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ نے شائع کی ہے۔ کاغذ طباعت نہایت عمدہ ہے۔ کتابت بھی آجکل کے لحاظ سے عمدہ ہے۔

یہ کتاب اردو املا کا خلاصہ ہے اور کوئی نئی بات اس میں نہیں ہے۔ وہی باتیں ہیں، جن پر اردو املا کی تنقید میں اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ تاہم چند مقامات پر اظہار خیال کی ضرورت تھی۔ اس لئے عرض کرتا ہوں۔ کتاب کے نام میں کیسے کا لفظ غیر فصیح ہے۔ "اردو کیونکر لکھیں"۔ ہوتا تو مناسب تھا۔ کیونکر کا لفظ طباطبائی نے بھی استعمال کیا ہے۔ دیکھو شرح دیوانِ غالب طباطبائی۔ اس شعر کی شرح میں :-

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے   ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا

... مرزا یاس لکھنوی نے بھی استعمال کیا ہے۔ دیکھو چراغ سخن ص۲۳

ص۴۷ کھینچنا متعدی میں نون غنہ ہے۔ لازم میں نہیں ہے۔

ص۵۹ ٹھنٹھ اور کھنٹھ دونوں کے آخر میں ہائے مخلوط ہونی چاہیے چھیچھڑا میں یائے معروف اور گھونگنیاں میں واو معروف ضروری ہے۔

ص۶۲ پیاؤ۔ نہ اسم مبالغہ ہے نہ اسم مفعول۔ حاصل مصدر ہے اسم ظرف کے معنی میں اور اس کا تلفظ بھی اسم مبالغہ کی طرح نہیں۔ چل چلاؤ کی طرح ہے۔

ص۱۰۳ آخوند۔ اہلِ دہلی اس لفظ کو ہمیشہ سے دال کے ساتھ بولتے اور لکھتے چلے آئے ہیں۔ اور یہی صحیح ہے۔ بغیر دال کے آخون صحیح نہیں ہے۔

ص۱۰۶ صحیح لفظ اشغولہ ہے اور اسی طرح لکھنا چاہیے۔ تلفظ آپ جس طرح چاہیں کریں۔

ص۱۰۸۔ اہرام مصر۔ الف کے نیچے زیر غلط لگایا گیا ہے۔ صحیح بالفتح ہے۔ یہ ہرم کی جمع ہے۔

ص۱۱۹ درہ۔ بفتحتین صحیح ہے۔ رائے مشدد کے ساتھ غلط ہے۔

ص۱۲۱ ڈبّا۔ صحیح تو بفتح اول ہے۔ بعض آدمی بکسر اول بھی بولتے ہیں۔ اس کی اصل ڈب بفتح اول ہے۔ اسی سے ڈبا اور ڈبیا بنے ہیں۔

ص۱۲۲ رضائی بھائی غلط لکھا ہے۔ صحیح لفظ رضاعی ہے رضاعت ہے۔
رحمت اللعالمین غلط ہے۔ رحمۃ للعالمین صحیح ہے۔ ردیّہ میں واؤ پر زبر غلط ہے۔ بواؤ مکسور صحیح ہے۔
ص۱۲۴ سوارت کیا لفظ ہے؟
ص۱۲۵ فِطین طوئے سے ہے۔ ت سے نہیں۔ فلیتا۔ اصل لفظ پلیتہ فارسی ہے اور اسی معنی میں فتیلہ عربی لفظ ہے۔
ص۱۳۰ گڈریا۔ گاف کے بعد ڈال ہے۔ ڑ نہیں۔
ص۱۳۱ لمباؤ۔ غیر فصیح اور متروک۔ لمبائی یا لمبان فصیح ہے۔ لیبی کا صحیح املا لیپی ہے۔
ص۱۳۲ نِہٹا۔ بضم اول وفتحۂ ثانی صحیح ہے۔
ص۱۳۳ ہبنّق۔ خالص عربی لفظ ہے معنی ہیں احمق اور کوتاہ قد۔ عرب میں ایک شخص تھا یزید بن ثروان جو حماقت میں مشہور تھا۔ اس کا لقب ہبنقہ تھا۔ اس بنا پر لفظ ہبنق حماقت کے لئے ضرب المثل ہوگیا۔ آصفیہ میں لفظ ہونق بھی غلط اور اس کے تحت جو کچھ لکھا ہے سب غلط ہے۔

معیارِ فصاحت

زبان و قواعد اور اردو املا کو پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ فاضل مصنف کے نزدیک فصاحت کا کوئی معیار ہی نہیں۔ ہر طبقے کی، ہر جگہ کی، علما و ادبا کی، شہروں کی، دیہات کی غرضکہ ہر زبان فصیح ہے۔ ہم ایسی بدگمانی نہیں کرسکتے۔ یہ خیال نہیں کیا جاسکتا کہ فاضل مصنف فصیح و غیر فصیح کا امتیاز ختم کردینا چاہتے ہیں۔ فصاحت کا معیار اور غلط و صحیح کا امتیاز تو دنیا نے مانا ہے اور ہمیں بھی ماننا پڑیگا ورنہ زبان و ادب کی عمارت یکسر منہدم ہوجائے گی۔

زبانوں کا فرق مختلف علاقوں میں آب و ہوا کے اور تہذیب و معاشرت کے اختلاف کا لازمی نتیجہ ہے۔ لیکن ٹکسالی زبان اور معیاری ادب ایک ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک اہم مثال یہ ہے کہ قرآن مجید کے اجزا ہر ایک علاقے کے لوگوں نے اپنے اپنے علاقوں اور قبیلوں کی زبانوں اور لہجوں میں لکھ رکھے تھے۔ جامع قرآن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام عرب میں پھیلے ہوئے اجزا کو جمع کیا اور ایک

نسخۂ ٹکسالی زبان (لغت قریش) کا مرتب کر کے باقی تمام اجزا کو نذرِ آتش کر دیا۔
البتہ ہم اپنے قصورِ فہم کی وجہ سے یہ نہیں سمجھ سکے کہ فاضل مصنف نے کیا معیار مقرر کیا ہے۔ مندرجۂ ذیل الفاظ و محاورات کو کس معیار پر جانچا جائیگا؟
کھینچنا کو ایک جگہ بیائے مجہول بولا جاتا ہے۔ دوسری جگہ بیائے معروف۔ چھپنا بضم اول اور بکسر اول۔ لینا اور دینا۔ بکسر اول اور بفتح اول۔ ملانا اور رلونا۔ اُڑسنا، گھرسنا، کھوسنا۔ عزت اور راجت۔ لذت اور لجت۔ ڈگمگانا بکسرۂ ڈال و میم اور بفتحۂ ڈال و میم۔ تلملانا بفتح تا و میم اور بکسرۂ تا و میم۔ دھکیلنا اور ڈھکیلنا وہاں اور وتھواں۔ یہاں اور یہیاں۔ گھڑنا اور گڑھنا۔ الجھنا بضم اول اور بکسر اول سنبھالنا بفتح اول اور بکسر اول۔ اٹھلانا بفتح اول اور بکسر اول۔ ایک جگہ دکھاؤ کی جگہ کہتے ہیں بتاؤ۔ اُس سے کہو کی جگہ اُس کو بولو۔ ایک جگہ اندر کے بجائے بھیتر۔ بہت کی جگہ تکگوں کہا جاتا ہے۔ دکھائی نہیں دیا کی جگہ دیکھا نہیں بیائے معروف۔ ایک شخص کہتا ہے میں نے کھانا کھا لیا ہے، چائے پی لی ہے۔ دوسرا کہتا ہے میں کھانا کھا لیا ہوں چائے پی لیا ہوں۔ ایک کہتا ہے پاس آؤ دوسرا کہتا ہے کینے آؤ۔ ایک کہتا ہے پیٹ دیا دوسرا کہتا ہے شوڑ دیا۔ ایک جگہ بھوک، دوسری جگہ کھوجیڑ۔ ایک جگہ ڈھُکَل دوسری جگہ ڈھُر۔ ایک جگہ ٹھلنگ دوسری جگہ گھنگی ایک جگہ بیچنا کو بیکنا کہتے ہیں۔ پُل کو پڑ کہتے ہیں۔ ایک جگہ ٹُنڈنا بالضم دوسری جگہ بالکسر۔ ایک کہتا ہے وہ بھاگ گیا دوسرا کہتا ہے وہ بھاگ لیا۔ ایک کہتا ہے مجھے بازار جانا ہے۔ دوسرا کہتا ہے میں نے بازار جانا ہے۔ ایک کہتا ہے چائے گرم زیادہ تھی میرے ہونٹ جل گئے۔ دوسرا کہتا ہے میرے ہونٹ سڑ گئے۔ ایک کہتا ہے بٹھانا دوسرا کہتا ہے بیٹھالنا۔ ایک کہتا ہے برابر ہے دوسرا کہتا ہے بروبر۔ ایک کہتا ہے چمچہ دوسرا کہتا ہے چمچ اور قشوغا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ جو زبان میں بول رہا ہوں وہی اردوئے معلٰی ہے اور اس سے زیادہ صحیح و فصیح کوئی زبان نہیں۔ جو اعلانچی کہتا ہے ـــ" جو زائرین دلّی کے مقدس مقامات کی زیارتیں کرنا چاہتے ہیں وہ ابھی آ کر اپنی سیٹیں بک کرا لیں۔ ہماری گاڑی کل صبح آٹھ بجے روانہ ہونے جا رہی ہے۔" وہ بڑے فخر کے ساتھ سر اونچا

کر کے یہ محاورہ استعمال کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ ملأ اعلیٰ کی زبان بول رہا ہے۔ جو شخص کہتا ہے۔ "میرے کو کپڑا خریدنا ہے، میرے سے لکھنا نہیں آتا، امین نے تیرے کو کتاب دی تھی" وہ بھی اپنے آپ کو زبان کے دار الضرب کا گورنر تصور کرتا ہے۔ جو شخص ہوٹل میں آواز لگاتا ہے " چاول دو شوربا مار کے" وہ بھی یہی سمجھتا ہے کہ وہ گویا فصاحت و بلاغت کے دریا بہا رہا ہے۔

اور دور کیوں جائیے اس قسم کی بیماری میں تو ہم خود مبتلا ہیں۔ ہم بھی یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہی صحیح ہے اور جو کچھ دوسرا کہہ رہا ہے وہ غلط ہے۔ مثلاً ہمارا خیال ہے کہ زبان و قواعد، اردو املا اور" اردو کیسے لکھیں" کے مصنف کے چند الفاظ و محاورات بالکل غلط اور غیر فصیح ہیں۔ اور تینوں کتابوں کے صفحات ایسے الفاظ و محاورات سے بھرے پڑے ہیں۔ شاید ہی کوئی صفحہ خالی ہو۔ ہم تیسری کتاب میں سے چند نمونے پیش کرتے ہیں:-

ص۱۱ یعنی اس لفظ میں جتنے حرف آنا چاہیے اور جس ترتیب سے آنا چاہیے اسی طرح آئے ہوں۔"

ص۱۲ جس طرح بولنے والے کو لفظ کے معنی معلوم ہونا چاہیے۔"

ص۱۶ ہر حرف کے نقطے بالکل ٹھیک جگہ پر ہونا چاہیے۔"

ص۲۰ اس کی صراحت کی جانا چاہیے۔

ص۲۳ (اردو املا) دونوں (ی) لکھی جانا چاہیے۔

اگر یہ کہا جائے کہ مصدر میں وحدت و جمع تذکیر و تانیث نہیں ہوتی، تو کیا کہا جائیگا اس مشہور ضرب المثل کے متعلق ؟ "جیسی کرنی ویسی بھرنی" اور مندرجۂ ذیل شعر میں:

الفت میں ہے آبرو گنوانی   کب چشمۂ مہر میں ہے پانی

(مثنوی گلزار نسیم ص۱۳۶ مرتبۂ ظہیر احمد صدیقی)

مشہور محاورہ ہے۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ اس کو آپ کیونکر کہیں گے ؟

ص۲۵۹ (زبان و قواعد) یہ بھی دیسی دکھائی پڑتا ہے۔

ص۱۱ (اردو کیسے لکھیں) چند ہی لوگ ہوتے ہیں۔

پھول نہ ہو تو نہ رنگ کا وجود متعین ہو پائے گا، نہ خوشبو کو ٹھکانا ملے گا۔

ص۹۱ غالباً اسی لئے دوسری جگہ نہیں بنا پائی ۔
ص۱۰۱ ایک دوسرے سے اس طرح مل نہیں پاتے کہ مطلب خبط ہو جائے ۔
ص۲۵۹ (زبان و قواعد) نہیں مل پاتا ۔

واضح ہو کہ امکانِ وقوعِ فعل کے لئے لفظ سکنا معیاری اور فصیح لفظ ہے جو بلا استثناء ہر ایک فعل کے ساتھ ترکیب پاتا ہے اور خود تنہا استعمال میں نہیں آتا۔ لفظ پانا اس موقع پر لفظی حیثیت سے بھی ، معنوی حیثیت سے بھی اور منطق کی رو سے بھی نہایت گھٹیا لفظ ہے ۔ مثلاً مندرجۂ ذیل جملہ دیکھیے :-

"بہت کوشش کے باوجود میں اس کو نہ پا سکا"۔ جو لوگ سکنا اور اس کے مشتقات کو استعمال نہیں کرتے وہ کہیں گے ۔ "بہت کوشش کے باوجود میں اس کو نہ پا پایا" "بہت غور کیا مگر میں اس کے منشا کو نہ پا پایا" اور دیکھیے ، نہیں کھپ پاتے نہیں چھپ پایا ۔ لفظی حیثیت سے تنافر پیدا ہو گیا ۔

بڑے تقاضوں کے بعد اُس سے چند روپئے مل سکے ۔ آپ کہیں گے ۔ "چند روپئے مل پائے" دو ہم معنی الفاظ کا اجتماع ہو گیا ۔ "تیشے بغیر کوہکن اپنی جان نہ کھو سکا" آپ کہیں گے ۔ "اپنی جان نہ کھو پایا" اس میں دو متضاد المعنی الفاظ کا اجتماع ہو گیا ۔ یہ معنوی سقم ہوئے ۔

اب منطقی تصور کو لیجیے ۔ سکنا کا مفہوم امکان و قدرت علی الفعل ہے بالفعل وقوع لازم نہیں ۔ اور پانا کا مفہوم حصول و یافت یا لفعل وقوع پذیر ہونے سے تعلق رکھتا ہے ۔ مثلاً مجھ سے کوئی پوچھے کہ تم اس عبارت کا مطلب سمجھ سکتے ہو ؟ میں کہونگا ۔ "ہاں غور کر کے سمجھ سکتا ہوں" ۔ آپ کہیں گے "ہاں غور کر کے سمجھ پاتا ہوں" کوئی پوچھے ۔ کیا تم دستخط کر سکتے ہو ۔ میں کہوں گا ۔ ہاں کر سکتا ہوں ۔ دوسرا کہے گا "ہاں کر پاتا ہوں"

دیکھیے پہلے جواب سے صرف امکان اور قدرت ظاہر ہے ۔ دوسرے جواب سے وقوع با ستمرار ۔ حالانکہ صیغہ دونوں میں ایک ہی ہے ۔ یہ منطقی سقم ہوا ۔ اور چند مثالیں دیکھیے :-

کیا تم ابھی بازار جا سکو گے ؟ ہاں جا پاؤنگا ۔ تم نے کھانا کھا لیا ؟ کھانا

تو کھایا مگر پانی نہیں پی پایا یا اسکو جگہ سے نہیں ہٹایا جاسکا۔ اسکو جگہ سے نہیں ہٹایا جا پایا۔ اسکو ملایا نہیں جاسکیگا اس کو ملایا نہیں جا پائے گا۔ کیا تم دریا میں پیر سکتے ہو؟ ہاں پیر پاتا ہوں۔ میں اس کو نہیں اپنا سکا، میں اس کو نہیں اپنا پایا۔ اس کتاب کے دس روپے تک دے سکتا ہوں، بولو۔ اس کتاب کے دس روپے تک دے پاتا ہوں، بولو!

منطقی بحث فاضل مصنف کی خاطر چھیڑی گئی۔ ورنہ صرف لفظی و معنوی بحث کافی تھی۔

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زبان کے اصول ارتقا کے ناگزیر تقاضوں کے مطابق مذکورۂ بالا الفاظ و محاورات پر منطقی تصورات کا ٹھپا کیونکر لگ پائے گا؟"

تینوں کتابوں میں جہاں کہیں اعراب کا ذکر آیا ہے۔ فاضل مصنف اپنی مستقل عادت کے مطابق لکھتے ہیں۔ میم پر زیر، عین پر زیر وغیرہ۔ یہ ایک مزید جدت ہے۔ زبر اور پیش کو اوپر کہا کرتے تھے۔ اب زیر بھی حرف کے اوپر کہا جاتا ہے۔

اردو کو سب سے بڑا سانحہ جو پیش آیا ہے وہ یہ ہے کہ زبان کے لغات و محاورات کم سے کم تر ہوتے جارہے ہیں۔ فصاحت و بلاغت کا کوئی معیار باقی نہیں رہا۔ جو لوگ زبان کی خدمت کے مدعی ہیں ان کا منتہائے خدمت کانفرنسیں منعقد کرنا ہے۔ اردو کی تاریخ پر طویل و عریض خطبے اور مقالے لکھ کر سیمیناروں میں پڑھے جاتے ہیں جن میں عربی فارسی کے بھاری بھاری اور مغلق الفاظ ہیں فلسفۂ تاریخ اور شاعروں کے کلام کا فلسفہ بیان کیا جاتا ہے۔

تعلیم گاہوں کا حال یہ ہے کہ جیسی بھی اپنے دوستوں نے کتاب لکھ دی۔ وہ داخلِ نصاب ہو گئی۔ ایک قابل تعلیم یافتہ شخص جو ہندوستان کے کسی ایسے دور دراز گوشے کا رہنے والا ہے جہاں کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ اس کے دل میں شوق پیدا ہوا کہ اردو جو ایک بین الاقوامی زبان ہے وہ بھی سیکھے۔ مگر تعلیم یافتہ آدمی کے سوچنے کا انداز اپنے معیار کے مطابق ہوتا ہے۔ اس نے سوچا، چلو دلّی چلو وہیں اردوئے معلّٰی پیدا ہوئی۔ وہیں کے اردو بازار میں شاہانِ مغلیہ کی سرپرستی میں پلی بڑھی اور پروان چڑھی۔ وہاں معیاری اور ٹکسالی زبان سیکھنے کا موقع ملے گا۔ وہ بڑا

اشتیاق لے کر شاہجہان آباد آیا۔ اور ایک مشہور تعلیمی ادارے میں داخل ہوا۔ اسکو جامعہ ملیہ اسلامیہ کا بنیادی قاعدہ شروع کرایا گیا۔

پہلے ہی سبق میں پڑھایا گیا ۔"سرو نہ نجمہ کہاں سے لائیں" وزن شعر زبان پر رواں نہو سکا۔ پھر سرو تا کو بجائے مختفی لکھا ہوا دیکھا۔

دوسرے سبق میں رنگ برنگا پڑھایا گیا۔ برنگا کی بے کے نیچے خوب موٹا سا زیر لگایا گیا ہے۔ رنگ برنگ کا لفظ بھی بہت سی جگہ آیا ہے۔ اور جہاں بھی آیا ہے قصداً خوب موٹا سا زیر لگایا گیا ہے۔ اس طرح پڑھکر ایک نکتہ اُس کے ہاتھ آیا۔ وہ یہ کہ مکرر اسموں کے بیچ میں جب ب آئیگی تو مکسور ہوگی اور اس کے نیچے لازمی طور پر خوب موٹا سا زیر لگایا جائیگا تاکہ کوئی مفتوح پڑھ ہی نہ سکے جیسے رنگ برنگ، روز بروز، ماہ بماہ، سال بسال، دست بدست، قدم بقدم، کو بکو، کوچہ بکوچہ، تازہ بتازہ، نو بنو، دو بدو، رو برو، لمحہ بلمحہ، ساعت بساعت، منزل بمنزل، گھر بگھر، دن بدن وغیرہ

اسی دوسرے سبق میں پڑھا" دو ہیں جرٹ" اس نے کہا جڑیں ہونا چاہیے۔ استاد نے جھڑک دیا۔

اسی سبق میں مٹی کے میم کے نیچے قصداً زیر لگایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ لفظ پہلے ماٹی تھا۔ اس سے مٹی ہوا۔ اصل کے لحاظ سے تقبیح اول ہے۔

ص۶ ڈلیہ میں ہیں پونیاں رکھیں۔ مصرع کی نثر یوں ہے۔ ڈلیا میں پونیاں رکھی ہیں۔ کیا یہ صیغہ صحیح ہے؟ اور کیا پونی بواو معروف ہے؟ ڈلیا کو ڈلیہ لکھا گیا ہے۔ اور قوافی کا حال کچھ نہ پوچھو!

ص۸ پر ایک ہی نظم میں پتنگ مذکر بھی ہے، مؤنث بھی۔ اور کیوں نہ ہو۔ لڑکے بھی اس درسگاہ میں پڑھتے ہیں اور لڑکیاں بھی۔ اگر لڑکا پتنگ اڑائے تو پتنگ مذکر ہے۔ لڑکی اُڑائے تو مؤنث۔ اور دیکھیے بچوں کو کیا عمدہ تنبیہ کی ہے۔ گدھا کھڑا ہے آگے دیکھو!

ص۱۰ چھڑی کی تصویر میں لکھا ہے چھڑ۔ کیا ان دونوں کا فرق معلوم نہیں؟

ص۱۴ پنسل کی پے کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔ پہلے چلمن کے وزن پر پنسل بولا جاتا تھا۔ اب تو ادنیٰ کے بچے بھی پینسل صحیح انگریزی اسپیلنگ کے مطابق بولتے اور لکھتے ہیں۔

ص۲۱ ادکھلا کی سیر اوکھلے کی سیر نہیں ؟

ص۳۰ " ہر ہر چیز بنائی تو نے " فصیح یوں ہے ۔ ہر اک چیز بنائی تو نے ۔
تو دنیا کا دنیا تیری + نیر ساری شان ہے تیری ۔ یہ خطاب کس سے ہے ؟ کیا حمد ایسی ہی ہوتی ہے ؟

اس کے بعد بنیادی قاعدہ دوسرا حصہ

ص۵ کوا بیٹھا آگ جلائے ۔ لفظ جلائے کیا صیغہ ہے اور ترکیب میں کیا واقع ہوا ہے ؟

ص۱ لیکن اس کو ہلکی پکڑو ۔ لفظ کو کے ہوتے ہوئے ہلکی بتانیث ؟

شخص مذکور نے بنیادی قاعدے کے دونوں حصے پڑھنے کے بعد اور بھی کتابیں اردو کورس کی پڑھیں ۔ مگر اس کی حیرانی بڑھتی جاتی تھی ۔ وہ سوچتا تھا کہ کیا یہی وہ ٹکسالی اردوئے معلیٰ ہے ؟ اردو بازار کی اردوئے معلیٰ ۔ داغ ، امرناتھ ساحر ، منشی ذکار اللہ کے شہر کی زبان ۔ کیا اسی شہر میں چنڈی پرشاد شیدا ، آغا شاعر ، سائل ، بیخود ، ذنا تر یہ کیفی راشد الخیری ، خواجہ حسن نظامی ، حکیم اجمل خاں ، سید جالب دہلوی ، ڈپٹی نذیر احمد ۔ وغیرہ رہتے تھے ۔ کیا یہی وہ لال حویلی ہے جس میں ظفر بہادر شاہ نے چار دیوان کہہ ڈالے ۔ اور جس کے سامنے چاندنی چوک کے ایک حصے کا نام اردو بازار تھا ؟ وہ سوچتا تھا کہ ابھی تو سائل و بیخود اور حسن نظامی و کیفی کو مونھ موڑے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ۔ اردوئے معلیٰ ابھی سے مٹ گئی ؟ افسوس ! اب پچھتاوے کیا ہووت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت ۔

غزل

تمہارے غم نے شگوفے کھلائے ہیں کیا کیا
فریب ہم نے محبت میں کھائے ہیں کیا کیا

وہ جن کی لَو سے ہزاروں چراغ جلتے تھے
چراغ بادِ فنا نے بجھائے ہیں کیا کیا

کوئی سوار بھٹک کر ادھر بھی آ جائے
دیے امید کے ہم نے جلائے ہیں کیا کیا

نہ تابِ دید نہ بے دیکھے چین ہی آئے
ہمارے حال پہ وہ مسکرائے ہیں کیا کیا

کمالِ یاس سے آنکھوں میں اشک بھی نہ رہے
وگرنہ ہم نے خزانے لٹائے ہیں کیا کیا

لرز گیا ہے جہاں دستِ کاتبِ تقدیر
ہماری زیست میں لمحات آئے ہیں کیا کیا

نقاب اٹھاؤ تو قصہ ہی ختم ہو جائے
تمہارے پردہ نے فتنے اٹھائے ہیں کیا کیا

زمانہ ہلکا سا خاکہ نہ لے سکا جن کا
نقوش دستِ قضا نے مٹائے ہیں کیا کیا

یہ پنج شیل یہ جمہوریت یہ رائے عوام — یہ اہلِ زر نے کھلونے بنائے ہیں کیا کیا
مری بلندیٔ ہمت کو بس خدا رکھے — فلک نے راہ میں کانٹے بچھائے ہیں کیا کیا

بلائے جاں ہوئی واصف کی بیگناہی بھی
ذرا سی بات میں الزام آئے ہیں کیا کیا

استدراک

علم کا کوئی منتہا اور میدانِ تحقیق کی کوئی سرحد نہیں ہے۔ جب کوئی منزل آتی ہے تو ہم یہ سمجھ کر ڈیرے ڈالتے ہیں کہ اب ہم نے میدانِ علم وتحقیق کو سر کر لیا۔ ناگاہ آواز آتی ہے "میں بھی ہوں" مڑ کر دیکھتے ہیں کہ جہل ساتھ ساتھ چلا آرہا ہے۔

پہنچ کر سرحدِ منزل یہ کیوں شاداں ہے اے رہرو
ابھی تو دیکھنا ہے وسعتِ منزل کہاں تک ہے

ہم کیسی ہی اولوالعزمی اور احساسِ سبقت کے ساتھ منزل پر پہنچیں اور فخر کے ساتھ ذہن میں یہ تصور قائم کریں کہ ہم تمام رفقاؤ اقران سے سبقت لے گئے ہیں مگر جہل ایک ایسا رفیق ہے جو کسی وقت اور کسی مقام پر ہم سے نہیں بچھڑتا۔

جب اردو مصدر نامہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا اُس وقت اِس سے زیادہ کوئی تصور نہیں تھا کہ فارسی مصدر نامے کے ڈھنگ پر بارہ تیرہ صفحے میں اردو کے کچھ مصادر بچوں کے یاد کرنے کے لئے جمع کر دیئے جائیں۔ لیکن قلم کا سفر شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ فارسی کا مصدر نامہ اور چیز ہے اور اردو کا مصدر نامہ اور چیز ہے۔ افعال کا جتنا ذخیرہ عربی کے بعد اردو میں ہے۔ دنیا کی کسی دوسری زبان میں شاید نہیں ہوگا۔ میں نے نہ صرف تمام قدیم اور متروک افعال کو نظر انداز کیا بلکہ قلیل الاستعمال اور غیر فصیح نیز علاقائی لغات کو ترک کیا پھر بھی خاصی ضخیم کتاب ہوگئی۔

فارسی میں افعال کی بہت کمی ہے۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے وہ کسی فعل کے ساتھ ایک اور لفظ شامل کرکے مصدر بنا لیتے ہیں۔ مثلاً آنکنا، اُڑنا، اُکھرنا، بھبانا، بدکنا، بولنا، بوجھنا، بھٹکنا، پچھاڑنا وغیرہ۔ فارسی میں ان معانی کے لئے مفرد الفاظ نہیں ملتے۔ عربی میں کئی کئی لفظ مختلف کیفیات کو بتانے والے ملتے ہیں۔ اگرچہ اردو میں بھی بہت سے مصادر مرکب ہیں مثلاً اُٹھانا، بٹھانا، اُبلنا وغیرہ مگر اب مفرد ہی کے حکم میں ہیں۔

میں اس امر کو کچھ پسند نہیں کرتا کہ مفرد لفظ کو تو ترک کر دیا جائے اور نیا مرکب بنا کر استعمال کیا جائے ۔ مثلاً آنکنا کے بجائے قیمت لگانا یا اندازہ کرنا کہا جائے ۔ اکھرنا کے بجائے ناگوار ہونا کہا جائے ۔ بکسنا کے بجائے بوسیدہ ہونا کہا جائے ۔ دیکھو بکسنا کتنا عمدہ لفظ ہے جو ہم نے معطل کر رکھا ہے ۔ اور ایک یہی کیا ؟ اپنی زبان کے کتنے ہی اہم اور خوبصورت لغات کو ہم بھولتے جا رہے ہیں ۔ فلسفہ اور تاریخ پر خطبات اور مقالات لکھنے میں سارا زور صرف ہو رہا ہے ۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ۔ کہنا یہ ہے کہ "اردو مصدر نامے" کی تالیف کے وقت میری رائے تھی کہ جو الفاظ عام طور پر غلط استعمال ہوتے ہیں ۔ اور فصیح سمجھے جاتے ہیں ان کی صحت کی کوشش کرنا اور اصل کی طرف واپس لے جانا مشکل اور فضول ہے ۔ یہ ٹھیک ہے اور رائے تو اب بھی یہی ہے ۔ فرق صرف انتخاب کا ہے ۔ اُس وقت بعض ایسے الفاظ کو بھی غلط العام تصور کر لیا گیا تھا جو درحقیقت اس کے مستحق نہیں تھے ۔

میں اردو املا اور زبان و قواعد کے مصنف کی کاوشوں کو سراہتا ہوں اور ممنون ہوں کہ اُن کی کاوشوں کے مطالعہ ہی نے میرے لئے اعتدال کی راہ نکالی ۔

جن قدرداں اصحاب کے پاس اردو مصدر نامہ پہنچ چکا ہے ان سے عرض کرتا ہوں کہ اِس میں مندرجۂ ذیل اصلاح فرما لیں :۔

ص۲۷ س۴ ۔ لفظ مجرب اور متلاشی کو قلم زد کر دیا جائے ۔

ص۲۳۹ س۶ ۔ لفظ رہائش کے ساتھ صرف اتنی عبارت باقی رہے گی ۔ "مؤنث ۔ حاصل مصدر ۔ یہ فارسی کے قاعدے سے رہنا کا بناوٹی حاصل مصدر ہے ۔ اور غیر فصیح ہے ۔" سطر نمبر ۷ سے ۱۰ تک قلم زد کر دیجئے ۔

ص۳۷۵ س۲۲ لفظ ہتیانا قلم زد کر دیا جائے ۔ بس ہتھیانا ٹھیک ہے ۔

حروفِ ہجا اور ان کے نام

حروفِ ہجا کو حروفِ تہجی بھی کہتے ہیں ۔ مراد ہیں وہ مفرد حروف جن سے ترکیب پا کر لفظ بنتا ہے ۔ عربی میں حروفِ ہجا اٹھائیس ہیں جو درج ذیل ہیں :۔

ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک
ل م ن و ہ ی ۔

اردو میں حروف ہجا ۳۵ ہیں۔ اردو چونکہ مخلوط زبان ہے اس کے حروف ہجا میں ایرین نسل کی یادگار حرف ژ اور ہندی کا حرف ڑ اور دیگر مختلف حروف بھی شامل ہیں۔

اب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ی۔ اب رہا بھ پھ وغیرہ کا معاملہ۔ یہ جن آوازوں کے ترجمان ہیں ان کے لئے کوئی مفرد شکل تجویز کر کے حروف ہجا کی تعداد میں اضافہ نہیں کیا گیا۔ اور چونکہ ان میں ہائے ہوز کی آواز مخلوط ہے اس لئے کتابت میں دو حرفوں کو ملا کر ایک آواز کی ترجمانی کا فائدہ حاصل کر لیا گیا۔ اور یہی صورت مناسب اور بہتر تھی۔ ان آوازوں کے علاوہ اور بھی آوازیں ہیں جن کے لئے کوئی مفرد حرف کی شکل تجویز نہیں کی گئی۔ جیس پہ لفظ پیار پیاس وغیرہ میں بحث کی جا چکی ہے۔

مذکورہ بالا حروف ہجا میں بعض حروف کی کئی کئی شکلیں ہیں۔ مثلاً الف کی ایک دوسری شکل بھی ہے جس کو ہمزہ کہتے ہیں۔ ی کی ایک دوسری شکل بھی ہے جس کو بڑی یے کہتے ہیں۔ اور بعض حروف بالکل ہم شکل ہیں جیسے ب ت وغیرہ

جب کتابت اور اس سے آگے بڑھ کر خوشنویسی کا مسئلہ سامنے آیا تو ضرورت اس بات کی تھی کہ مفرد حروف کی تمام مختلف شکلوں سے قلم اور نظر کو آشنا کیا جائے ہم شکل حروف کی صرف ایک شکل کافی تھی۔ ضرورۃً ایک ایسے مرکب دوحرفی کو بھی لے لیا گیا جو کئی شکلوں میں لکھا جاتا ہے۔ اور چونکہ اس کی صحیح اور خوبصورت شکل بنانے کا ڈھنگ بڑی محنت اور مشق سے آتا ہے لہذا مفردات سے ہی اس کی مشق شروع کرا دی گئی وہ ہے لام الف۔ تو نسخ میں خوشنویسی کی مشق کے لئے مندرجۂ ذیل تختی تجویز کی گئی۔

ا ب ت ج د ذ ر س ص ط ع ف ق ك ک ل م ﻣ ن و ہ ھ ﮩ ﻬ ﻻ لا ﻼ ء ى ے۔ اس کے بعد نستعلیق کی مندرجۂ ذیل تختی تجویز ہوئی:-

ا ب ت ج د ر س ش ص ط ع ف ق ک ل م ن و ہ ھ ﮩ لا ء ی ے۔

ہمزہ الف ہی کی دوسری شکل ہے۔ اور لام الف دو حرفوں کا مرکب ہے۔ اگرچہ نستعلیق میں اس کی ایک ہی شکل اختیار کی گئی ہے مگر اس کا جوڑ بہت نازک اور دشوار

طلب ہے۔ کافی مشق کے بعد قابو میں آتا ہے۔[۴] ~~اس لئے یا محض تقلیداً~~ مشق نستعلیق میں بھی اس کو مفردات کی تختی میں شامل رکھا گیا۔

جن لوگوں نے بچوں کو زبان سکھانے کے لئے قاعدے لکھے انھوں نے ناواقفیت کی وجہ سے لام الف کو حرفِ ہجا سمجھ کر تعلیمی قاعدوں میں درج کر دیا۔ اب اس کی اصلاح کی صورت یہ ہے کہ تعلیمی قاعدوں میں پہلے صرف حروف ہجا کی تختی درج کی جائے اسکے بعد مختلف اشکال والی مکمل تختی درج کی جائے۔ تاکہ بچے پہلے حروف مفردہ کی مختلف شکلوں سے واقف ہو جائیں۔ پھر مرکبات میں جو شکلیں بدلتی ہیں وہ سکھائی اور بتائی جائینگی۔ لام الف کی گنجائش تعلیمی قاعدے میں قطعاً نہیں ہے۔ یہ محض خوشنویسی سے تعلق رکھتا ہے ~~ہے اور اردو میں تو اس کی صرف ایک ہی شکل ہے۔ لام کی تختی میں اسکی مشق ہو جائیگی۔~~

عربی میں حروف ہجا کے بعض ناموں کا آخری حرف الف ہے۔ فارسی میں الف کا امالہ کر کے یائے مجہول میں تبدیل کر دیا گیا۔ ت اور ط کی آواز میں امتیاز رکھنے کیلئے طوئے میں واو معدولہ شامل ہوا یہی نام اردو میں بھی صدیوں سے رائج ہیں۔ حتیٰ کہ بہت کم لوگ ہیں جو عربی قرآنی قاعدے میں اصل عربی نام کہلواتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر یہی امالہ شدہ نام کہلوائے جاتے ہیں۔

اب کہا جا رہا ہے حروف ہجا کے ناموں میں تبدیلی ہونی چاہیے۔ تمام حروف کے نام دو حرفی ہونے چاہئیں اور سب کا دوسرا حرف الف ہونا چاہیے۔ با، ٹا، جا، دا، سا وغیرہ۔ یعنی اردو ترقی نہیں کر سکتی۔ جب تک اس کے حروف ہجا کے نام نہ بدلے جائیں۔ اس کو تجدد پسندی کے جنون کے سوا اور کیا کہا جائے۔ یہ غریب اردو اپنے پرانے ہی ناموں کے ساتھ بیرونی ممالک میں پہونچ چکی ہے۔ یہاں اس پر تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے بخشو بی بلّی، چوہا لنڈورا ہی بھلا۔

اس تجدد پسندی کا دائرہ ذرا اور وسیع ہونا چاہیے۔ انگریزی زبان کے بھی حروف تہجی کے نام بدلنے چاہئیں۔ یہ اب ہماری ملکیت بن آچکی ہے ہماری حکومت کا سارا کاروبار اور علوم و فنون کا اعلیٰ معیار سب انگریزی میں ہے۔ ہمیں اس پر ہاتھ صاف کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے۔ خاص طور سے یہ بھی دیکھنا ہے کہ آیا اس میں مرکب حروف ہجا ہیں یا نہیں؟ یعنی ایک آواز کی ترجمانی کے لئے دو حرفوں کو یا تین حرفوں کو ملایا گیا ہو۔ یا اس کے برعکس کہ دو آوازوں

کی ترجمانی کے لئے ایک ہی حرف ہو۔ اگر یہ کوتاہیاں اس میں ہیں تو تعجب ہے کہ انگریزی اقصائے عالم پر کیونکر چھا گئی ؟ اور دنیا بھر کے علوم و فنون کی عظیم الشان کتابیں اس میں کیوں کر تصنیف ہو گئیں۔

اردوئے معلی کی ترقی کے منصوبے بنانے والوں اور اس کی تشہیر کے لئے کانفرنسیں منعقد کرنے والوں اور غیر معیاری کتابوں پر انعامات تقسیم کرنے والوں اور گھٹیا قسم کے نصاب تصنیف کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے والوں سے میں پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپکو بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ چند فلسفیانہ مقالات اور چند مؤرخانہ خطبات صدارت لکھوا کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے زبان کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ حالانکہ جہاں تک زبان کا معاملہ ہے ان مقالات و خطبات میں چند افعال اور چند حروف جارہ و حروف عطف و حروف ربط (میں، سے، کو، اور، تھا، ہے) وغیرہ کے سوا اردو زبان کا کوئی لفظ نہیں ہوتا اور اس کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی شیریں پاکیزہ اور فصیح و بلیغ زبان کا جو سمینار یا مشاعرہ آپ منعقد کرتے ہیں اس کا ڈھنڈورچی تمام شہر کے گلی کوچوں میں اور سڑکوں پر پکارتا پھرتا ہے۔

"آج رات کو آٹھ بجے فلاں جگہ ایک بھاری مشاعرہ ہونے جا رہا ہے، پاکستان سے بھی کئی شاعر لوگ آئے ہیں۔ سب لوگوں کو چاہیے جلدی پہونچ جائیں، دیر سے آنے والوں کو جگہ نہیں مل پائیگی"۔

اور آپ ان گلی کوچوں اور ان بازاروں سے بہت دور کوٹھیوں میں بیٹھے ہوئے خوش ہو رہے ہیں کہ ہم نے اردو کو بام ترقی پر پہونچا دیا۔

عزم سفر مغرب و رو در مشرق
اے راہرو پشت بمنزل ہشدار

رسم الخط اور املا

فاضل مصنف نے رسم الخط کی مندرجہ ذیل تعریف کی ہے :۔

"رسم خط، کسی زبان کو لکھنے کی معیاری صورت، کا نام ہے"۔

تعریف الجھوں یا مجہول اسی کو کہتے ہیں۔ جیسے آپ سے کوئی پوچھے ایٹم کیا چیز ہے؟ آپ کہیں جز لایتجزیٰ۔ سائل دوبارہ آپ سے پوچھنے میں ہچکچائے گا اور

کسی محقق سے جا کر پوچھے۔ جزلا یتجزی کیا ہوتا ہے؟ وہ کہے ایٹم۔

خود رسم خط کا لفظ اپنے مفہوم کو جتنا واضح کر رہا ہے وہی کافی تھا۔ معیاری صورت تو ایک پہیلی ہوگئی۔ اب اسے کون پوچھے گا؟ ومن املا کی تعریف لکھی ہے:۔

"رسم خط کے مطابق صحت سے لکھنے کا نام املا ہے"

معلوم ہوا کہ رسم الخط اور املا ایک ہی چیز ہے۔ معیاری صورت تو ہے رسم خط اور معیاری صورت کے مطابق لکھنا املا ہے یعنی رسم خط کے مطابق ہو تو صحیح املا ہے اور مطابق نہو تو غلط املا ہے۔

اور دعویٰ مصنف کا یہ ہے کہ" املا اور رسم خط دو چیزیں ہیں"۔

اس عنوان پر فاضل مصنف نے" اردو املا" میں سولہ سترہ صفحے لکھے ہیں۔ پھر" اردو کیسے لکھیں" میں بھی اس پر خامہ فرسائی کی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اطناب لاطائل اور سعی بے حاصل ہے۔ سیدھے سادے انداز میں ان دونوں کی تعریف یہ ہونے چاہیے تھی۔

رسم الخط۔۔۔ لغوی معنی ہیں حرفوں کے نقوش بنانا یا لکھنا۔ اصطلاحاً تلفظ کیے جانے والے حروف کی جو شکلیں کاغذ پر لکھی جاتی ہیں اور پھر حروف سے مرکب ہو کر الفاظ کی جو ہیئت بنتی ہے اس کو رسم الخط کہتے ہیں۔ اس تعریف میں وہ تمام جزئی تغیرات شامل ہیں جو حروف میں بحالت ترکیب شوشوں وغیرہ کی شکل میں واقع ہوتے ہیں۔

املا۔۔۔۔ لغوی معنی ہیں بول کر لکھوانا۔۔ اصطلاحاً، لفظ کو انھیں حروف میں لکھنا جن سے وہ مرکب ہو کر بنا ہے اور ان کی ترتیب کو قائم رکھنا۔ حروف مکتوبہ غیر ملفوظہ بھی اس میں شامل ہیں۔

اب ان دونوں کو امثلہ سے سمجھیے:۔

تغیر، چیز، تیر، خیر، غیرہ کو باضافۂ شوشہ لکھنا۔۔ ذہن، بہت، ہندی میں سے ہائے ہوز کی گھنڈی اڑا دینا۔ انتشار، بیش، طیش میں ایک دو شوشوں کا اضافہ گھر اور گھی کو کہنی والی ھ سے لکھنا۔ کوشش کو دو کششوں سے لکھنا۔ اللہ کو اللہ، روشنی، آگاہی کو بڑی یے سے لکھنا۔ یہ سب رسم الخط کی غلطیاں ہیں۔

واقعتہً، کلیتہً میں الف کا اضافہ۔۔۔ موسیٰ، عیسیٰ، مرتضیٰ، مصطفیٰ کی ی کو الف سے بدل دینا۔۔۔ غرض کو غرز، لحاظ کو لحاز، احتیاط کو احتیات، رجحان کو رجہان

مختار کو مختیار، معمّیٰ کو معمہ، ازدحام کو اژدحام، آذر (نام والد ابراہیمؑ) کو آزر، زکریا کو ذکریا، زخار کو ذخار لکھنا۔ آذر جو ایرانی مہینے کا نام ہے وہ ذال سے صحیح ہے۔ نقشہ، نصیبہ، خاکہ، گلہ، صلہ کو الف سے لکھنا۔ مزاج کو مجاز، پتھر کو بھتر، اکٹھا کو اکھٹا، درخواست کو درخاست اور اولوالعزم، ذوالفقار کو بغیر واؤ کے لکھنا یہ سب املا کی غلطیاں ہیں۔

مصنف نے اکثر جگہ رسم الخط کے لئے بھی املا کا لفظ استعمال کیا ہے اور میں نے بھی اپنے مقالے میں شاید کہیں کہیں مصنف کی ہی تعبیر کے مطابق لکھ دیا ہوگا۔ اس سے قارئین کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ بس یہ یاد رکھنا چاہیے کہ لفظ کی صورت نویسی کا مقرر و متعارف ڈھنگ رسم الخط ہے۔ اور لفظ کو اس کے پورے اور مرتب اجزائے ترکیبی کے ساتھ لکھنا املا ہے۔

املا نامہ

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

ابھی چند روز ہوئے ایک دوست نے کتاب املا نامہ مرتبہ ڈاکٹر نارنگ مجھے لا کر دی۔ میں نے اس کا مطالعہ کیا۔ یہ اردو املا مصنفہ رشید حسن خاں کا خلاصہ ہے۔ اس میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس پر اوراق گذشتہ میں بحث نہ کی گئی ہو۔ البتہ دو تین جگہ مرتب کو توجہ دلانا ضروری معلوم ہوا۔ وہ چند مقامات مندرجۂ ذیل ہیں :-

املا نامہ صـ۱ــ ۔ دہائی کے معنی میں دہا کا لفظ ایجاد کیا گیا ہے جو بالکل بے ضرورت ہے۔ دہائی کیا بُرا تھا؟ دہا عورتوں کی زبان میں ماہ محرم کا نام ہے۔

" صـ۱۹ــ ۔ لوگ کے ساتھ کئی کا لفظ غلط اور اہل زبان کے محاورے کے خلاف ہے۔ یہ ایسا ہی غلط ہے جیسا ایک لوگ، دو لوگ، تین لوگ وغیرہ۔ اس کی جگہ بعض لوگ یا کچھ لوگ صحیح ہے۔

" صـ۲۳ــ ۔ غلطاں کو "ت" سے لکھنا صحیح نہیں۔ کیونکہ یہ عربی لفظ "غلط" سے بنایا گیا ہے جس طرح طنبیدن کو "ت" سے لکھنا غلط ہے۔

" صـ۵۹ــ ۔ شبہہ اور توجیہ کے ثبوت کتاب میں غلط ہیں۔

الامانہ صسے ۔ کسمسانا، تمتمانا، ٹمٹمانا، گنگنانا، کنکنا، گلگلہ، ڈلدل ۔ ان الفاظ کے ٹکڑے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ لکھنے میں کوئی دشواری نہیں ہے ۔

ترادف الفاظ

ترادف کے معنی ہیں دو لفظوں کا ہم معنی ہونا۔ یہ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے کہ مترادف الفاظ کا وجود ہے یا نہیں؟ صدیاں گذر چکی ہیں مگر اس کا فیصلہ نہ ہو سکا اور ہو بھی نہیں سکتا۔ جب تک کہ دماغ کو خیالی فلسفے کے چکر سے نہ نکالا جائے ۔ دراصل یہ عرب کے علمائے لغت کا مبحث ہے اور وہیں سے یہ بحث شروع ہو کر دوسری زبانوں کے ادیبوں تک پہنچی۔ انھوں نے اس مسئلہ پر بہت کچھ قلم فرسائی کی ہے ۔ بعض علمار کا دعویٰ ہے کہ ترادف کا وجود ہی نہیں ۔ ایک معنی اور ایک مدلول کے لئے ایک ہی لفظ ہو سکتا ہے۔ اور اگر دو لفظ بظاہر ہم معنی معلوم ہوتے ہوں تو ان میں بھی کوئی نہ کوئی باریک فرق ضرور ہوتا ہے ۔ اور یہ ممکن ہے کہ ایک لفظ تو اُس معنی کے لئے بطور نام کے وضع کیا گیا ہو اور دوسرا اس کے لئے بطور صفت یا استعارے کے بولا گیا ہو ۔

اصل بحث تو یہیں تک تھی ۔ بعض حضرات نے اس سے آگے بڑھ کر یہ عظیم الشان نظریہ پیش کیا کہ دنیا کی کسی زبان میں ترادف الفاظ ممکن نہیں ۔ اس موضوع پر فارسی میں اگر کسی نے کچھ لکھا ہے تو بہت مختصر لکھا ہے اور اہل عرب کا تتبع کیا ہے ۔ اردو زبان میں جہاں تک میرا خیال ہے اس پر کسی اہل فن نے کچھ نہیں لکھا ۔ البتہ زبانوں پر یہ رعب آفریں جملہ اکثر پایا گیا ہے کہ "ماہرین لسانیات کا مسلّمہ ہے کہ دنیا میں مترادف الفاظ کا وجود نہیں"۔ یہ دعویٰ زبان سے نکلتے ہی سننے والوں کے ہوش و خرد پر بجلی کی طرح گرتا ہے۔ مگر جب غور کیا جاتا ہے تو پتہ نہیں چلتا کہ اس استقرائی مسئلے کو امتناع عقلی کا جامہ کیوں پہنا دیا گیا ہے ۔

ہم کو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب عربوں نے یونان کے خیالی فلسفے کو اپنایا تو تمام علوم و فنون کو منطق اور فلسفے کے اصولوں پر تولنا شروع کیا یہاں تک کہ اکثر مصنفین اور علمانے دین فطرت کے سادہ مسائل کو بھی منطقیانہ موشگافیوں کے ساتھ خلط ملط کر دیا ۔ یہ بیچارہ ادب و شعر کب محفوظ رہ سکتا تھا۔ چونکہ طبیعت دقت پسندی کی عادی ہو چکی

تھی۔ لہذا ادب و لغت کے سیدھے سادے استقرائی و منقولی مسائل میں معقولی دلائل سے کام لینا شروع کیا۔ حالانکہ کسی لفظ کی حقیقت معلوم کرنے کا صاف اور سیدھا طریقہ یہ ہے کہ اہل زبان کی بول چال میں اس کے محل استعمال کو دیکھا جائے۔ نہ یہ کہ من گھڑت منطقی مقدمات مرتب کرنے شروع کر دیئے جائیں۔ اگر زبان و ادب میں عقلی احتمالوں کو ٹھونسا جائے تو بیشمار محاورات و استعارات سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ مثلاً کشتن (قتل، مار ڈالنا) صرف اُسی چیز کی طرف منسوب ہو سکتا ہے جو جاندار ہو تو چراغ کشتن کا محاورہ فارسی میں غلط ہونا چاہیے۔ اسی طرح اُردو میں لفظ مرنا کی نسبت سے "پانی کا دیوار میں مرنا" غلط ہونا چاہیے۔ کیونکہ پانی کوئی جاندار چیز متحرک بالارادہ نہیں ہے۔ لفظ کھانا کے ساتھ کس قدر محاورے بولے جاتے ہیں۔ فریب کھانا، ٹکر کھانا، گالی کھانا وغیرہ حالانکہ اصل میں موتھ سے کھانا ہے کسی چیز کو جو موتھ کا فعل قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

عربی زبان میں ترادف الفاظ

عربی زبان دنیا کی زبانوں میں وسیع ترین زبان ہے۔ اور ایک مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بیشمار الفاظ کا ذخیرہ اس میں موجود ہے۔ انسان جب بات کرنا چاہتا ہے تو یہ کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم الفاظ اور کم سے کم وقت میں اپنی پوری بات ظاہر کر دے اور اسی کا نام فصاحت و بلاغت ہے۔ یہ جامعیت صرف لغت عرب کو حاصل ہے۔ ایک مدلول کی مختلف کیفیتوں اور متفرق صفات کے ساتھ اس کے بیشمار نام عربی زبان میں موجود ہیں۔ چونکہ اکثر الفاظ میں مدلول کی صفات و کیفیات کے تغیر کا لحاظ پایا جاتا ہے۔ اس لئے خیالی فلسفے کے عادی دماغوں نے یہ مفروضہ بنا لیا کہ دنیا میں ترادف الفاظ کا وجود نہیں ہے۔ اور جب ان کے سامنے دو ہم معنی لفظ پیش کیے جاتے ہیں تو زمین و آسمان کے قلابے ملاتے یا خیالی گھوڑے دوڑاتے ہیں اور آخر میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی لطیف فرق ضرور ہوگا۔

اہل عرب میں سے جو لوگ ترادف کے قائل نہیں ہیں وہ بڑی دور از کار اور لاطائل بحث کرتے ہیں۔ مثلاً عربی میں "قعود" اور "جلوس" کے معنی ہیں "بیٹھنا" کہتے ہیں یہ دونوں مترادف نہیں اور دونوں کے معنی میں یہ فرق ہے کہ قعود کے معنی ہیں کھڑے سے بیٹھنا۔ اور جلوس کے معنی ہیں لیٹے سے اُٹھ کر بیٹھنا۔ ایک کی جگہ دوسرا

لفظ نہیں بولا جا سکتا۔ یہ ایک اہم مثال ہے جو اس موقعہ پر پیش کی جاتی ہے لیکن ہمیں اس کی صحت میں شک ہو جاتا ہے۔ جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ سجدے سے اُٹھکر بیٹھنے کی حالت کو قعدہ کیوں کہتے ہیں؟ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے ــ قال بینا نحن عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذ طلع علینا رجل شدید بیاض الثیاب، شدید سواد الشعر لا یُرٰی علیہ اثر السفر ولا یعرفہ منا احد حتیٰ جلس الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ (نسائی شریف کتاب الایمان)

یہاں اُس آنے والے کے لئے جو جبریل امین تھے جَلَسَ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اس موقع پر حضرت جبریل امین کے بارے میں اُٹھکر بیٹھنے کا تخیل۔۔ غلط ہے۔ اس سے اگلی روایت ہے :ــ فبنینا لہ (ای لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) دُکّانا من طین کان یجلس علیہ۔

بہرحال جو کچھ بھی ہو اپنی مادری زبان میں ہی بسا اوقات ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں تو کسی دوسری زبان کے باریک مسائل میں کیا لب کشائی کی جائے۔ ہاں یہ ضرور عرض کروں گا کہ اردو زبان میں تو مجھے بیشمار مترادف الفاظ ملتے ہیں۔ میں جو کچھ سمجھا ہوں عرض کرتا ہوں۔

اُردو زبان کا ذخیرہ

اردو زبان میں جب ہم الفاظ کے عظیم الشان ذخیرے پر نظر ڈالتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت زیادہ الفاظ دوسری زبانوں سے آئے ہیں۔ اردو الفاظ کو بناوٹ کے لحاظ سے ہم تین قسموں میں منقسم کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) دخیل ــ ایسے الفاظ جو دوسری زبانوں سے اصلی شکل و صورت میں لے کر اردو میں داخل کر لیے گئے خواہ ان میں سے کسی کے معنی میں تغیر کر لیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔ جیسے ــ صحن، باغ، چراغ، کرسی، کتاب، خط، قلم، ضد، دکان وغیرہ۔

(۲) مُتغیّر ــ ایسے الفاظ جو اصلی شکل و صورت کے ساتھ اردو میں منتقل نہیں ہوئے بلکہ اُن کی شکل و صورت بغیر کسی قاعدۂ صرفی کے بدل گئی ہے۔ جیسے سائنس۔ (اصل میں سائنس تھا)، سپرڈنٹ (اصل میں سپرن ٹن ڈنٹ تھا)، کپتان (اصل میں

کیپٹن تھا)، لفٹنٹ (اصل میں لفٹی ننٹ تھا)، لالٹین (اصل میں لینٹرن تھا)، ڈلا کواڑ کا (اصل میں ضلع تھا)، اَدلہ (اصل میں عقلہ تھا) بنبا (اصل میں نبع تھا)، تہمد (اصل میں تہ بند تھا) توشک (اصل میں دوتشک تھا)، مینار (اصل میں منارہ تھا) وغیرہ۔

(۳) مُولّد۔ ایسے الفاظ جن کی شکل وصورت کو ہم نے کسی صرفی قاعدے سے بدل کر یا بنا کر اپنی زبان میں شامل کرلیا ہو (خواہ اردو گرامر کے قاعدے سے بنایا ہو یا فارسی وعربی گرامر کے قاعدے سے۔ جیسے لرزنا جو لرزیدن سے بنایا۔ خریدنا خریدن سے۔ فلاکت یا مفلوک فلک سے، افلاس یا مفلس فلس سے۔ تمازت تموز سے۔ نزاکت نازک سے۔ بخشنا بخشیدن سے، بدلنا بدل سے وغیرہ

لفظ کی حقیقت

انسان اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لئے الفاظ کا محتاج ہے اور اس لئے قدرت نے اس کو نطق کا ملکہ عطا فرمایا ہے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ ہر مفہوم ومعنیٰ اور مدلول کے اظہار کے لئے لفظ اور اسم کا وجود ہو۔ اگر کوئی چیز پہلے سے انسان کے علم میں نہیں ہوتی تو جس وقت اس کے وجود کا علم ہوتا ہے اسی وقت اس کا نام بھی تجویز کرلیا جاتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی چیز معلوم وموجود ہو اور اس کے اظہار کے لئے کوئی نام یا لفظ نہ ہو۔

ایک معنیٰ اور مفہوم کے لئے ایک وقت میں یا متفرق اوقات میں ایک خطے میں یا متفرق خطوں میں کئی کئی لفظ تجویز کرلیے جاتے ہیں اور اس طرح دنیا میں (بلحاظ اختلاف آب وہوا) ہر قوم وملک کی زبان الگ الگ بنتی چلی جاتی ہے۔ جب دنیا کے تمام انسان ایک مدلول کے اظہار کے لئے الگ الگ الفاظ رکھتے ہیں تو ایک زبان کے بولنے والے بھی ایک مدلول کے لئے ایک لفظ اور ایک لفظ کے لئے ایک مدلول کے پابند نہیں ہوسکتے۔

ترادف الفاظ کے منکرین کہتے ہیں کہ ہر مدلول کے لئے ایک ہی اسم ہوتا ہے اور جہاں دو تین اسم دیکھے جاتے ہیں ان میں سے اسم ذات ایک ہی ہوتا ہے باقی صفات ہوتے ہیں۔ ان حضرات نے مترادف اسموں میں سے ایک کو اسم ذات اور باقی کو صفات قرار دیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اسم ذات کے اندر کوئی صفت ملحوظ نہیں ہوتی یعنی وہ ایک ایسا لفظ

ہوتا ہے کہ اگر اس میں سے اس کے مدلول کو سلب کر لیا جائے تو وہ بے معنی اور مہمل لفظ رہ جاتا ہے۔ اس میں صفت کا وجود نہیں ہے۔ اگر صفت ہوتی تو وہ اسم ذات کیوں ہوتا وہ صفاتی ناموں سے ممتاز اسی لئے ہے کہ وہ اسم ذات ہے۔ اگر یہی بات ہے تو میں دریافت کروں گا کہ "اَللّٰہ" کا اسم ذات کیا ہے؟ کیونکہ لفظ "اللّٰہ" اَلَہٗ یا وَلَہٗ سے نکلا ہے۔ جس کے معنی تحیر کے ہیں۔ اِلٰہ بمعنی متحیر کرنے والی ہستی۔ یہ صفت ہے اور خدا کے باقی نام بھی صفاتی ہیں۔ تو پھر ذاتی نام کیا ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ اسم ذات اور اسم صفت کی اصطلاح خالص شرعی اصطلاح ہے جو اسمائے باری تعالیٰ اور اسمائے رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص تھی۔ اس شرعی اصطلاح کی رو سے اگر دیکھا جائے تو رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے ذاتی نام قرآن حکیم نے دو عدد بتائے ہیں۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ اِسْمُہٗ اَحْمَدُ

اس میں شک نہیں کہ بہت سے اسماء ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ اگر ان کے مدلول کو سلب کر لیا جائے تو محض بے معنی اور مہمل رہ جاتے ہیں۔ مثلاً "پتھر" یا درخت۔ دریا۔ لکڑی وغیرہ۔ لیکن بہت سے اسما ایسے بھی ہیں کہ مدلول کو سلب کرنے کے بعد بھی با معنی رہتے ہیں۔ مثلاً "چارپائی"۔ اگر چارپائی کو نہ کہیں تو اس کے معنی ہیں چار پایوں والی چیز۔ یا تپائی۔ چوپایہ۔ دسپنا (دست پناہ) وغیرہ۔ پس اگر یہ سب صفات ہیں تو ان اشیاء کے لئے اسمائے ذات کیا ہیں؟ کیونکہ جس نام میں صفت کا مفہوم پایا جاتا ہو اسکو منکرین ترادف اسم ذات نہیں کہتے۔

اس مسئلے کی تحقیق یہ ہے کہ جب کوئی لفظ کسی مفہوم یا مدلول کے لئے وضع کیا جاتا ہے تو اکثر و بیشتر مدلول کی کوئی صفت یا کیفیت یا آواز کے ساتھ مشابہت اس کے اندر ملحوظ ہوتی ہے۔ ماں باپ جب اپنے بچے کا نام سعید حمید عزیز وغیرہ رکھتے ہیں تو بطور تفاؤل و تیمن یا بطور اظہار واقعہ کے اس کے صفتی معنی ملحوظ ہوتے ہیں۔ پیر کے دن پیدا ہوا تو پیرن اور بدھ کے دن پیدا ہونے والے کو بدھو، جمعہ کے دن پیدا ہونے والے کو جمّا وغیرہ کہتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا محقق یا سراغ رساں پیدا ہوا ہوتا جو واضعین الفاظ کی نشاندہی کرتا تو ان سے وضع الفاظ کے اسباب بہت آسانی سے معلوم کیے جاسکتے تھے اور ان صفاتی معنی کو بھی سمجھا جاسکتا تھا جن کو ملحوظ رکھ کر الفاظ وضع کیے گئے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ الفاظ کا واضع کون ہے؟ منکرین ترادف کہتے ہیں کہ "واضع اللغۃ عز وجل حکیم علیم" (المزہر للسیوطی حصہ اول ص ۲۲۷) اگر لغت کا خالق خدائے قادر و توانا ہے تو کیا وہ اس بات پر قادر نہیں تھا کہ ایک معنی کے اظہار کے لئے کئی لفظ یا ایک لفظ کے لئے کئی معنی بناتا؟ یقیناً وہ قادر تھا اور اس سے بہت کچھ زیادہ پر بھی قادر ہے۔ اور لاریب اس نے ایک معنی کے لئے کئی کئی لفظ اور ایک لفظ کے لئے کئی کئی معنی پیدا کیے۔ اور اگر انسان کو بھی وضع الفاظ میں کچھ دخل ہے (مثلاً وضع اصطلاحات وغیرہ) تو سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان ایک معنی کے لئے دو لفظ کیوں نہیں بنا سکتا اس میں کونسا استحالۂ عقلی لازم آتا ہے؟

یہ معلوم کرنا کہ فلاں لفظ کونسے سنہ و تاریخ میں بنا اور کس شخص نے بنایا تقریباً ناممکن ہے۔ اصطلاحات کے بارے میں بھی یہ سراغ رسانی مشکل ہے۔ مگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اکثر الفاظ کسی نہ کسی صفت یا مناسبت کی بنا پر وجود پذیر ہوتے ہیں۔ حیوان ناطق کی یہ فطری شان ہے کہ وہ جان بوجھ کر بے معنی اور مہمل لفظ نہیں بولتا۔ جب وہ کسی نئی حقیقت کو دریافت کرتا ہے یا کسی نئی چیز کو معلوم کرتا ہے تو اس کے اظہار کے لئے بامعنی الفاظ ہی استعمال کرتا ہے۔ اور اس کے لئے ایسا نام تجویز کرتا ہے جو اس کی کسی صفت کو ظاہر کرے یا اور کوئی مناسبت رکھتا ہو۔ پھر وہی لفظ نام بن کر مشہور ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد وہ واضع بھی باقی نہیں رہتا اور اس لفظ میں اگر کوئی سابقہ معنی ہوں تو وہ بھی بھلا دیئے جاتے ہیں۔ بنانے کا سبب اور مناسبت وغیرہ سب باتیں فراموش ہو جاتی ہیں۔ مثلاً شمشیر اور آسمان اور چمٹا وغیرہ۔ جب یہ الفاظ بولے جاتے ہیں تو کونسا شخص ہے جس کے ذہن میں ناخن اور چکی اور چمٹنے کا تصور آتا ہو؟

میکہ دراصل مائی کا یعنی ماں کا گھر تھا۔ مگر لکھنے اور بولنے کے وقت کیا کسی کے ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ یہ پہلے بھی مہمل نہیں تھا۔ انیس۔ انتیس اصل میں ایک اون ایس۔ اور ایک اون تیس تھا۔ اون کے معنی پراکرت میں کم کے ہیں۔ اور ایس اصل میں ویسی تھا۔ جس کو اب بیسی کہتے ہیں۔ یعنی ایک کم بیس اور ایک کم تیس۔

(قواعد اردو از مولوی عبدالحق)

غرضیکہ ہر لفظ کی تہ میں کوئی نہ کوئی صفت یا مناسبت موجود ہے۔ جس کی بنا پر

مدلول کو اس کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے۔ لہذا اسم ذات اور اسم صفت کا امتیاز اسی وقت تک ہے جب تک کہ کسی اسم صفت سے صفتی معنی مراد ہوں اور اس کو صفت کے اظہار کی نیت سے ہی بولا جائے۔

ترادُف کے اسباب وعلل

(۱) کسی مدلول کے لئے ایک کے بعد دوسرا لفظ اختیار کیا گیا۔ اور اتفاقاً پہلا بھی موجود رہا جیسے پہ، پر۔ مگر، لیکن۔ اور الیکشن، انتخاب، چناؤ۔ اور نشست، بیٹھک۔ اور آبدوز ڈبکنی۔ اور وزیر اعظم، پردھان منتری۔ اور گورنمنٹ، حکومت، سرکار۔ اور لیکچر، خطاب۔ اور اسپیچ۔ تقریر وغیرہ۔

(۲) ایک لفظ ایک مقام پر بولا جاتا ہے اور اسی معنی میں دوسرے مقام پر دوسرا بولا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ دونوں لفظ مشہور ہو جاتے ہیں۔ اور بسا اوقات ان دونوں کا اصلی مولد اور وطن بھی مشتبہ ہو جاتا ہے جیسے چھان بنان اور چھان بین۔ ایک مرتبہ چند ادیبوں میں یہ بحث ہوئی کہ ان دونوں میں سے دہلی کا محاورہ کونسا ہے۔ معاملہ استاد داغ کے سامنے پیش ہوا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ چھان بنان قلعۂ معلّی کا محاورہ ہے اور چھان بین شہر کا۔"

دہلی کے ایک علاقے میں لانگنا بمعنی پھلانگنا اور سوہنا بمعنی عمدہ اور رکنے بمعنی پاس بولا جاتا ہے۔

شہروں یا خطوں کی زبانوں میں بھی بہت فرق ہوتا ہے۔ جیسے چپٹا یو پی میں دسپنا دہلی میں کھاٹ، آنگن، ببول، برگد، بھیں یو۔پی میں اور چارپائی، انگنائی، کیکر، بڑھ، بھاگ دہلی میں وغیرہ

(۳) بعض الفاظ طبقاتی ہوتے ہیں کہ ایک سوسائٹی یا طبقے کے لوگ دوسروں سے مختلف زبان بولتے ہیں۔ بازاری زبان۔ عوام کی زبان، کرخنداری زبان، شعرا و ادبا اور علما کی زبان سب میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہوتا ہے۔ اور یہ بھی بغیر ترادف الفاظ کے نہیں ہو سکتا۔ مثلاً تاؤ بمعنی غصہ، جیس بمعنی ٹیس، چیک بمعنی تپک، بھٹی بمعنی تسخر، دل لگی بمعنی مذاق یا دلچسپی۔ لگائی بمعنی عورت۔ لونڈا بمعنی لڑکا وغیرہ عوام کی زبان ہے۔

عورتوں اور مردوں کی زبان میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً پنڈا بمعنی بدن۔ ڈھیٹ بمعنی بے شرم۔ مردوا بمعنی مرد وغیرہ عورتوں کی زبان ہے۔

ترادف محاورات میں بھی واقع ہوتا ہے۔ جیسے اندازہ کرنا اور اندازہ لگانا چھان بین اور چھان بنان۔ دوڑ دھوپ اور بھاگ دوڑ۔ دیکھ بھال اور غور و پرداخت وغیرہ۔ مگر اصطلاح میں ان کو مترادف نہیں کہتے۔ کیونکہ محاورہ مرکب ہوتا ہے دو یا تین لفظوں سے اور مترادف کی اصطلاح لفظ مفرد کے لئے بنائی گئی ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ علمائے ادب نے ایسے ہم معنی محاورات کے لئے کوئی اصطلاح بنائی ہے یا نہیں۔ (عرب کے علمائے لغت میں سے علامہ کیائی نے متوارد اور مترادف کی جو تفریق کی ہے وہ بھی قابل قبول نہیں ہے) میرے خیال میں ایسے محاورات کو متوازی محاورات کہنا چاہیئے۔ لیکن ایسے الفاظ جو مرکب ہو کر مثل مفرد کے ہو گئے ہیں ان کو مفرد ہی سمجھا جائیگا۔

فصاحت

فصاحت کا انحصار ترادف پر ہے۔ ایک لفظ کسی جگہ اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن دوسری جگہ وہی لفظ بُرا معلوم ہوتا ہے۔ اگر مترادفات کا وجود نہ ہو تو فصاحت کی عمارت قائم نہیں رہ سکتی اور فن کی حیثیت سے یہ علم ختم ہو جائے گا۔ مولنا شبلی نعمانی نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے ہم اس کے اقتباسات ذیل میں نقل کرتے ہیں: ـــ

علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے کہ "لفظ میں جو حروف آئیں ان میں تنافر نہ ہو۔ الفاظ نامانوس نہ ہوں۔ قواعد صرفی کے خلاف نہ ہو" اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لفظ درحقیقت ایک قسم کی آواز ہے اور آوازیں بعض شیریں، دل آویز اور لطیف ہوتی ہیں۔ مثلاً طوطی و بلبل کی آواز، اور بعض مکروہ و ناگوار مثلاً کوّے اور گدھے کی آواز۔ اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض شستہ سبک شیریں، اور بعض ثقیل بھدّے ناگوار۔ پہلی قسم کے الفاظ کو فصیح کہتے ہیں اور دوسرے کو غیر فصیح۔ یا بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ فی نفسہٖ ثقیل اور مکروہ نہیں ہوتے لیکن تحریر و تقریر میں ان کا استعمال نہیں ہوا ہے یا بہت کم ہوا ہے۔ اس قسم کے الفاظ بھی جب ابتداءً استعمال کیے جاتے ہیں تو کانوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو فن بلاغت کی اصطلاح میں غریب کہتے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ بھی فصاحت میں خلل انداز سمجھے جاتے ہیں۔ فصاحت کے مدارج میں اختلاف ہے بعض الفاظ فصیح ہیں بعض فصیح تر۔

فصاحت کے متعلق ایک بڑا دھوکا یہ ہوتا ہے کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ

لفظ سادہ آسان اور کثیر الاستعمال ہو۔ اس لیے لوگ مبتذل اور سوقی الفاظ کو بھی فصیح سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں میں سفید و سیاہ کا فرق ہے۔ ابتذال کے معنی عام طور پر یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو الفاظ عام لوگ استعمال کرتے ہیں وہ مبتذل ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ سیکڑوں الفاظ عوام کے مخصوص الفاظ ہیں لیکن سب میں ابتذال نہیں پایا جاتا ابتذال کا معیار مذاق صحیح کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔

یہ بحث مفرد الفاظ سے متعلق تھی لیکن کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے ان کی ساخت، ہیئت، نشست، سبکی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازن ہو۔ ورنہ فصاحت قائم نہیں رہے گی۔ قرآن مجید میں ہے: — ما کذب الفؤاد ما رأی۔ فؤاد اور قلب دو ہم معنی الفاظ ہیں اور دونوں فصیح ہیں۔ لیکن اس آیت میں فؤاد کے بجائے قلب کا لفظ لاؤ تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ گو قلب کا لفظ بجائے خود فصیح ہے۔ لیکن ماقبل اور مابعد کے جو الفاظ ہیں ان کی آواز کا تناسب قلب کے لفظ کے ساتھ نہیں ہے میرانیس کا مصرع ہے: —

فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور

صحرا اور جنگل ہم معنی الفاظ ہیں اور دونوں فصیح ہیں۔ میرانیس نے جا بجا ان دونوں لفظوں کو ہم معنی ہونے کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔ لیکن اگر اس مصرعے میں صحرا کے بجائے جنگل کا لفظ استعمال کیا جائے تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا۔ میرانیس کا ایک شعر ہے:

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں   جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

یہاں جنگل کے بجائے صحرا لاؤ تو مصرع پھس پھسا ہو جاتا ہے

شبنم اور اوس ہم معنی الفاظ ہیں۔ اور برابر درجے کے فصیح ہیں۔ لیکن میر صاحب کے اس شعر میں ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کے بجائے شبنم کا لفظ لایا جائے تو فصاحت خاک میں مل جائے گی۔ لیکن یہی اوس کا لفظ جو اس موقع پر اس قدر فصیح ہے۔ اس مصرع میں: —

شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

شبنم کے بجائے اوس لاؤ تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائے گی۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ جن الفاظ کے سلسلے میں وہ ترتیب دیا جائے اُن آوازوں سے اُس کو خاص تناسب ہو ورنہ گویا دو مخالف سروں کو ترکیب دینا ہوگا۔ (موازنۂ انیس و دبیر)

معلوم ہوا کہ شبنم اور اوس، صحرا اور جنگل کا کسی جگہ موزوں اور مناسب ہونا اور دوسری جگہ ناموزوں اور غیر مناسب ہونا اس وجہ سے نہیں ہے کہ ان کے معنی میں کوئی فرق ہے بلکہ صرف اس وجہ سے ہے کہ کسی جگہ کوئی لفظ سلاست و روانی کے لحاظ سے یا آواز کی مناسبت سے اچھا معلوم ہوتا ہے اور وہی لفظ دوسری جگہ اچھا معلوم نہیں ہوتا اور اسی علم کا نام معانی و بیان (یا علم الفصاحت) ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ "ترادف کا وقوع ناممکن نہیں ہے"۔

ترادف کی تعریف و تشریح

ترادف کی بحث میں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ ہمیشہ دو ہم معنی یا قریب المعنی لفظ مترادف ہی ہوں گے۔ تعریف مترادف کی یہ ہے کہ وہ دو مفرد الفاظ جن کا مدلول ہر اعتبار سے ایک ہو یعنی ایک ہی معنی اور ایک ہی چیز پر دلالت کریں۔ یہ دلالت لفظی ہوگی عقلی نہیں۔ جیسے انسان کا مترادف بشر اور آدمی ہے۔ مگر انسان اور حیوانِ ناطق مترادف نہیں ہیں۔ حالانکہ دونوں کا مدلول ایک ہی ہے۔

ہر اعتبار سے ایک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت دو لفظ ایک مدلول کیلئے بولے جائیں تو معنی اور مدلول میں کوئی امتیاز نہ پیدا ہو۔ یعنی اس کی کسی صفت یا کیفیت میں فرق نہ سمجھا جائے۔

چلنا، دوڑنا، بھاگنا۔ یہ تینوں فعل پاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ کیفیت میں فرق ہے اس لئے مترادف نہیں ہیں۔ بکنا، بولنا، کہنا اور کھانا۔ نگنا چبانا۔ اور پتیلا۔ پتیلی اور پیڑ پودا۔ اور گھر گھروندا۔ اور پتھر، پتھری۔ اور ٹھیکرا۔ ٹھیکری۔ اور تاگا اور ڈورا، ڈوری وغیرہ مترادف کی تعریف میں نہیں آتے۔

ایسا اسم صفت جس کے بولتے وقت اس کے صفتی معنی مراد نہ ہوں وہ اسم کا

مترادف ہو سکتا ہے - جانور - حیوان - جاندار تینوں کے ایک ہی معنے تھے - لیکن لفظ جاندار باقی دو لفظوں کا مترادف نہیں ہے - کیونکہ بولتے وقت اس کے صفتی معنی ہی مراد ہوتے ہیں - اور اس میں انسان بھی داخل ہے - جانور اور حیوان انسان کے لئے نہیں بولا جاتا -

مترادفات کی مثالیں

تاگا - دھاگا - رشتہ
ٹھہر جانا - تھم جانا
پٹک دینا - پٹخ دینا
پھسلنا - رپٹنا
پاؤں - پیر - قدم
خوبصورت - حسین - جمیل
مرض - بیماری - روگ
عدالت - کچہری
خاک - مٹی
غبار - گرد - دھول
کینہ - کپٹ
کردار - چال چلن - کیرکٹر
گھر - مکان
ممبر - رکن
کھمبا - ستون - تھم
محفل - سبھا - مجلس - بزم
سال - برس
طرف - جانب - اُور
سخی - داتا
گھومنا - پھرنا
اکھیڑنا - اکھاڑنا - اُپاڑنا

تہمد - لنگی
درخت - پیڑ
بچھونا - بسترا - بستر
سورج - آفتاب - خورشید
دھرنا - رکھنا
دھیرے دھیرے - آہستہ آہستہ
دم - سانس - نفس
لرزنا - کانپنا - تھرّانا
کپکپانا - تھرتھرانا
پسارنا - پھیلانا
بلبلانا - تلملانا
پگڈنڈی - بٹیا - جادہ
تھامنا - پکڑنا
محبت - پریم
دشمنی - عداوت
لوٹ آنا - پلٹ آنا - پھر آنا - واپس آنا
جھگڑا - ٹنٹا
ڈگمگانا - لڑکھڑانا
چھٹانا - چھڑانا
چھاتا - چھتری
سایہ - چھاؤں

دابنا - دبانا
چابنا - چبانا
ٹانگنا - لٹکانا
منگنی - سگائی
آنچ - شعلہ - لپٹ
اوس - شبنم
بیٹا - پوت - پسر
خوشدامن - ساس
آڑا - ترچھا
بانکا - ٹیڑھا
پیشانی - ماتھا - جبین
ڈھانکنا - ڈھانپنا
لونڈی - باندی
لونڈیا - لڑکی - بچی - بیٹی
ضد - ہٹ
لجانا - شرمانا - جھینپنا
انتخاب - الیکشن - چناؤ
بڑھ - برگد
کیکر - ببول
چق - چلمن - چلون
پچھتاوا - پشیمانی

ماں ۔ مائی ۔ ماتا	چھل ۔ فریب ۔ دھوکا
نگری بستی ۔ آبادی	چندیا ۔ ٹانٹ

کنجی ۔ تالی ۔ چابی ۔ عام طور سے تینوں مترادف بولے جاتے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ لفظ "چابی" کو گھڑی گھنٹے کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے ۔ اور تھا بھی یوں ہی ۔ کیونکہ محاورہ میں چابی دینا بولا جاتا ہے ۔ کنجی دینا یا تالی دینا نہیں بولتے ۔ مگر مفرد ہونے کی صورت میں یہ لفظ قفل کی کنجی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ لہذا کثرتِ استعمال کی وجہ سے اب تینوں مترادف ہیں ۔

طمانچہ ۔ چانٹا ۔ تھپڑ ۔ چپت ۔ یہ چاروں لفظ میرے خیال میں مترادف ہیں ۔ البتہ دھول اور دھپ کے معنی کچھ علیحدہ ہیں ۔

رسنا اور ٹپکنا ۔ ٹوٹنا اور پھوٹنا مترادف نہیں ہیں ۔ لنگڑا ۔ لولا ۔ لنجا ۔ ٹنڈا ۔ بھی مترادف نہیں ہیں ۔ لنگڑا وہ جو ایک ٹانگ سے معذور ہو ۔ لولا وہ جو دونوں ٹانگوں سے معذور ہو ۔ لنجا وہ جو چاروں ہاتھ پاؤں سے معذور ہو ۔ ٹنڈا اور ٹنٹا وہ جس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہو ۔

اشتراک الفاظ

منکرین ترادف نے اشتراک الفاظ سے بھی انکار فرمایا ہے ۔ کہتے ہیں ایک لفظ کے کئی معنی نہیں ہو سکتے ۔ مشترک الفاظ کی چند مثالیں مندرجۂ ذیل ہیں :-

نواسی ــ عدد (۸۹) اور بیٹی کی بیٹی ۔

گھٹنا ــ مصدر ۔ اور ایک عضو جسم انسانی ۔

بال ــ بمعنی موئے جسم ۔ اور ۔ بمعنی گیہوں کا خوشہ

اسی طرح سیکڑوں مشترک الفاظ ہماری زبان میں موجود ہیں ۔ مگر یہ مسئلہ ہمارے موضوع سے خارج ہے ۔ اس لئے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ۔

خاتمۂ کلام

اس اطناب سے میرا مدعا یہ تھا کہ ترادف کے تمام پہلوؤں کی اچھی طرح وضاحت ہو جائے۔ ترادف و اشتراک سے انکار کرنا بڑا ظلم ہے۔ اور زبان کو ایک تنگ دائرے میں محدود کر دینا ہے۔

مولوی اصغر علی روحی اپنی کتاب دبیر عجم میں ترادف کا انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"الحق کہ در اطلاق ایں لفظ مسامحتے ورزیدہ اند والا ترادف الفاظ حقیقتے است کہ نزد ماہرین السنہ اصلے ندارد"۔

اس انکار میں بھی نادانستہ اقرار کا پہلو نکل آیا ہے۔ تعجب ہے کہ حقیقت کو بے اصل کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ہمیشہ وہ دو لفظ مترادف ہوں گے جنکو مصنفین کتب لغت مترادف کے طور پر لکھدیں۔ کیونکہ یہ چیز ڈکشنری سے معلوم نہیں ہو سکتی بلکہ اہل زبان کے میل جول اور ذوق سلیم کے ساتھ تحقیق و جستجو سے معلوم کی جاتی ہے۔

حفیظ الرحمان واصف

کاپی میں چند صفحات خالی رہ گئے تھے۔ میں نے واجد ماجد سے کچھ اور طلب کیا انھوں نے اپنا مندرجۂ ذیل مضمون جو مئی ۱۹۷۳ء میں لکھا گیا تھا۔ عطا فرمایا۔

(محمد قاسم)

ماضی کا ایک ورق

یادش بخیر! اب سے کوئی پچاس برس پہلے کی بات ہے۔ راقم الحروف کا عہد طفلی تھا۔ شہر دہلی کے گلی کوچوں میں کبھی کبھی ایک بوڑھے پوشم پوش شخص کو دیکھتا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں دوتارا ہوتا تھا۔ وہ ایک غزل نہایت دردناک آواز میں گاتا تھا۔ جہاں وہ بیٹھ جاتا تھا اور دوتارے پر غزل چھیڑ دیتا تھا۔ وہاں ٹھٹ کے ٹھٹ آدمیوں کے جمع ہو جاتے تھے۔ بعض سننے والوں کے آنسو بہنے لگتے تھے۔ بعض آہیں بھرتے تھے۔

بوڑھے کے بشرے سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی پیشہ ور بھکاری ہے۔ لباس اس کا اکثر صاف ستھرا ہوتا تھا۔ سر پر سفید عمامہ ہوتا تھا اکثر مندرجۂ ذیل اشعار پڑھتا تھا:۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں میرے دل کو قرار ہے

کروں غم ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے

وے شہر دہلی یہ تھا چمن کہ تھا سب طرح کا یہاں امن

وہ خطاب اس کا جو مٹ گیا فقط اب تو اُجڑا دیار ہے

یہ رعایا ہند تباہ ہوئی کہو کیا کیا ان پہ جفا ہوئی

جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابلِ دار ہے

یہ ستم کسی نے بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لاکھوں کو بیگناہ

ولے کلمہ گویوں کی طرف سے ابھی دل میں ان کے غبار ہے

اس کی دردناک آواز دوتارے کی آواز کے ساتھ شامل ہو کر ایسا سماں باندھتی تھی کہ سننے والے بیخود ہو جاتے تھے۔ اس کو کسی سے پیسہ مانگتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ ہاں اگر کوئی اپنی خوشی سے کچھ دیدیتا تھا تو لے لیتا تھا۔ وہ اور بھی ایک دو غزلوں کے اشعار پڑھا کرتا تھا۔ مگر مجھے ان اشعار کی زمین بھی یاد نہیں رہی۔

مشہور تھا کہ بوڑھا شخص بہادر شاہ ظفر کی غزلیں گاتا ہے۔ اور آج تک یہی سنتے چلے آرہے ہیں کہ مذکورہ اشعار ظفر کے ہیں۔ ہمارا طالب علمی کا زمانہ تھا۔ بڑا تعجب ہوتا تھا کہ بہادر شاہ ظفر جس کے کلام کی فصاحت وبلاغت، روانی وسلاست بڑی حد تک ہمارے لئے سند ہے۔ یہ ناموزوں اشعار اس کے کیونکر ہو سکتے ہیں۔ پھر جب کچھ ذوقِ سخن پیدا ہوا تو اسلوب بیان

زبان اور بندش میں بھی نمایاں فرق پایا۔

اگرچہ ذوق و وجدان ہمیشہ انکار کرتا رہا لیکن ظفر کی طرف نسبت اس غزل کی ایسی مشہور تھی کہ کھل کر کبھی انکار کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ شروع میں یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید ان پڑھ گانے والے نے غزل کو ناموزوں کر دیا ہے۔ یا ممکن ہے ایسا ہوا ہو جیسا کہ قوالوں کی عادت ہے کہ چند شاعروں کی ایک ہی زمین کی غزلوں میں سے اشعار منتخب کر کے غزل مرتب کر لیتے ہیں۔ اور گاتے پھرتے ہیں۔ جس کا مقطع ہوتا ہے غزل اسی کی طرف منسوب ہو کر مشہور ہو جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ظفر کا کچھ کلام غیر مطبوعہ بھی ہے اور سینہ بسینہ روایت ہوا ہے۔ اگر ایسا ہے بھی تو درایت کی کسوٹی پر کسے بغیر آنکھیں بند کر کے مان لینا اہل ذوق و ارباب نظر کے لئے تو ممکن نہیں ہے۔

بہر حال یہ ایسی عالمگیر غلط فہمی تھی کہ لالہ سری رام نے خمخانۂ جاوید میں ظفر کے کلام کا جو انتخاب دیا ہے اس میں مندرجۂ ذیل تین شعر بھی دیئے ہیں :-

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں میرے دل کو قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تبہ ہوئی کہو اں یہ کیسی جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابل دار ہے
اے ظفر بھلا تجھے کس کا ڈر تو خدا کے فضل پہ کر نظر
تجھے ہے وسیلہ رسول کا وہی تیرا حامی کار ہے

میں نے ایک کتاب میں جس کا نام "فغانِ دہلی" ہے پوری غزل دیکھی ہے۔ اس کتاب کا مؤلف و مرتب تفضل حسین کوکب ہے۔ جو مرزا غالب کے تلامذہ میں سے ہے۔ اس کتاب میں اس نے صرف ایسی نظموں کو جمع کیا ہے جو انقلاب ۵۷ء اور دہلی کی بربادی سے تعلق رکھتی ہیں۔ کتاب پر سن طباعت ۱۲۹۹ ہجری ہے جس کو اب تقریباً پچانوے سال ہوتے ہیں۔ مطبع چشمۂ فیض دہلی باہتمام منشی مہا نرائن۔

مذکورہ غزل حسامی کی ہے جن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کون صاحب ہیں۔ اتفاقاً ایک روز خمخانۂ جاوید کا مطالعہ کیا تو ان کا تذکرہ اور غزل بھی درج شدہ مل گئی۔

ان کا نام مرزا حسام الدین حیدر دہلوی خلف مرزا خانی ۔ ان کے بزرگ کسی زمانے میں صاحب اقتدار تھے ۔ مگر یہ خود گردش زمانہ سے بے علم رہے ۔ بنا ۱۳۰ ہجری میں حیات تھے اور اس وقت باون برس کی عمر تھی ۔ (مؤلف خمخانۂ جاوید نے ان کی مذکورہ بالا غزل بھی درج کی ہے اور اس کے تین شعر یعنی مطلع مقطع مع ایک شعر سراج الدین ظفر بہادر شاہ کے کلام میں بھی درج کیے ہیں) پوری غزل حشو و زوائد سے پُر ہے ۔ اور اکثر مصرعے ناموزوں ہیں ۔ یہ غزل ظفر کی طرف کیوں منسوب کر دی گئی ؟ سمجھ میں نہیں آتا ۔ اور پھر مقطع بھی گھڑ لیا گیا ۔ غزل مع عنوان درج ذیل ہے ۔ پڑھیے اور داد دیجیے ۔ مگر شرط یہ ہے کہ پڑھنے میں وزن بھی قائم رہے ۔

غزل نازک خیال شاعر بے مثال متخلص حسامی

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں میرا غم سے سینہ فگار ہے

ولے شہر دہلی یہ تھا چمن کہ سب طرح کا یہاں تھا امن
وہ خطاب اس کا جو مٹ گیا فقط اب تو اجڑا دیا رہے

ساری رعایا ہند تباہ ہوئی کہو کیا کیا اون پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا ہی حاکمِ وقت نے کہا یہ تو قابلِ دار ہے

شب و روز پھولوں میں جو تلیں کیوں نہ خارِ غم سے وہ چپ گلیں
ملے طوق قید میں جب اونھیں کہا بدلے گل کے یہ ہار ہے

جو سلوک کرتے تھے اور سے اب ہیں وہ دیکھو کس طور سے
وہاں تنگ چرخ کے جور سے رہا تن پہ اون کے نہ تار ہے

یہ پیڑ جو بوئے تھے ببول کے ہیں اون میں اب جو یہ پھل لگے
جیسے جیسے ہم نے گناہ کیے یہ اونھیں گناہوں کا بار ہے

پڑی آ کے جانوں پہ ایسی بن کہ نشے ہوئے سبھوں کے ہرن
جسے دیکھتا ہوں پڑا ہوا یہ گلے میں اشکوں کا ہار ہے

یو بال تن پہ ہے سر میرا نہیں جان جانے کا ڈر ذرا
بچے غم سے نکلے ہے دم میرا مجھے اپنی زندگی بار ہے

یہاں حال تنگ جو سب کا ہے یہ کرشمہ قدرت رب کا ہے
یہاں بہار میں تو خزاں ہوئی وہاں خزاں انھوں کو بہار ہے
یہ ستم کسی نے بھی ہے سُنا کہ دی پھانسی لاکھوں کو بیگناہ
وے کلمہ گویوں کی طرف سے ابھی دل پہ اون کے غبار ہے
نہ دبایا ہے زیر چمن اونھیں نہ دیا ہے گور دکفن اونھیں
یارو کس نے کیا ہے دفن اونھیں نہ ٹھکانے اونکا مزار ہے
نہ تو دشمنائی ہے غیر میں نہ اپنا یہاں کوئی دہر میں
چلا تیر اجل کا بھی شہر میں کیا لاکھوں کا جس نے شکار ہے
جس نے غم دیا ہے برملا خوشی بھی دے گا وہی خدا
اسے ہر بشر ہے جانتا کہ خزاں کے پیچھے بہار ہے
یہ زمانہ وہ ہے برا فلک چلو بچ کے سب سے الگ الگ
نہ رفیق کوئی کسی کا یہاں نہ کوئی کسی کا نہ یار ہے
کیا حامی ڈر ہے تجھے حشر کا جو خدا رکھے تجھے برملا
تجھے ہے وسیلہ رسول کا کہ وہ تیرا حامیٔ کار ہے (موبہو نقل کی گئی)

ایک دفعہ دہلی میں ایک طرحی مشاعرے کا اعلان کیا گیا اور مندرجۂ ذیل مصرع طرح تجویز کر دیا گیا۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

راقم الحروف کو معلوم نہیں کہ یہ مصرع کس کا ہے۔ بر سبیل تذکرہ مجھ سے کہا گیا کہ بہادر شاہ ظفر کا مصرع لکھ دیا گیا ہے۔ مصرع سنتے ہی میں نے فوراً کہا کہ یہ مصرع ظفر کا نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ احقر نے ظفر کے چاروں دیوان بالاستیعاب نہیں دیکھے ہیں اور آج تک یہ بھی معلوم نہیں کہ مصرع کس کا ہے۔ محض اپنے ذوق کی بنا پر انکار کر دیا۔ دوستوں نے بہت سعی و جستجو کی مگر ظفر کے کلام میں مصرع مذکور نہیں مل سکا۔ ایک اور غزل بہادر شاہ ظفر کی طرف منسوب کیجاتی ہے جس کا مطلع مندرجۂ ذیل ہے حالانکہ یہ غزل نواب اجد علی شاہ اختر لکھنوی کی ہے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں   جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

یہ چند الفاظ بطور تذکار ماضی کے تحریر کیے گئے اور بقاؤ دوام اُسی رب العزۃ کے لئے ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ (احقر حفیظ الرحمان واصف)